اسلام اور مستشرقین

جلد اول

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمان

بلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (۲۷۶۰۰۱)

اسلام اور مستشرقین

حصہ اول

فروری ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی) میں اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کی مختلف نشستوں کی روداد اس میں قلمبند کی گئی ہے۔

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی (الہند)

سلسلہ دارالمصنفین نمبر: ۱۵۱

نام کتاب	:	اسلام اور مستشرقین حصہ اول
نام مرتب	:	سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم
صفحات	:	۱۴۲
طبع جدید	:	۲۰۰۷ء
مطبع	:	معارف پریس شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ
ناشر	:	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ
قیمت	:	

باہتمام

عبدالمنان ھلالی

فہرست مضامین

اسلام اور مستشرقین

جلد اول

مضمون	صفحہ
دیباچہ	١
سمینار ٢ - ٣٧	
خیر مقدمی تقریر از سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	١١
خطبۂ استقبالیہ از مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	١۴
ڈاکٹر محمد محمود طنطاوی کی تقریر	٢۴
جناب حکیم محمد سعید کی تقریر	٢۴
مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی کا اظہار خیال	٢۵
مفتی سیاح الدین کاکاخیل پاکستان کی تقریر	٢٧
ڈاکٹر سید سلمان ندوی کی تقریر	٢٨
جناب سید حامد صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تقریر	٢٩
پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تقریر	٢٩
ڈاکٹر ابراہیم قریشی تھائی لینڈ کی تقریر	٣٠
ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری پٹرولیم یونیورسٹی طہران کی تقریر	٣١
جناب شوکت سلطان سابق پرنسپل شبلی کالج......	٣٢
ڈاکٹر یوسف قرضاوی ڈین شریعت فیکلٹی	٣٢

مضمون	صفحہ
قطر یونیورسٹی کا خطبۂ صدارت	
سمینار کی پہلی نشست ٣٧-۵١	
ڈاکٹر محمد محمود طنطاوی کی صدر شعبۂ شریعت وقانون عین یونیورسٹی ابوظبی کا مقالہ	٣٧
الاسلام انتشر بالسلم لابالسیف	
پروفیسر امیر حسن عابدی کا مقالہ	٣٩
"پروفیسر ایڈورڈ براؤن اور اسلام"	
پروفیسر خلیق احمد نظامی کا مقالہ	
"مستشرقین کے افکار ونظریات کے مختلف دور اور اصلاح حال کی راہ"	۴٣
مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا مقالہ	۴۵
"پروفیسر اجناس گولڈزیہر"	
مولانا تقی الدین ندوی کا تبصرہ	۴٩
سمینار کی دوسری نشست ۵١ - ۵٩	
ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب قطر یونیورسٹی کا مقالہ "المستشرقون والتاریخ"	۵١
پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا مقالہ "سرہملٹن گب"	۵٢

مضمون	صفحہ
ڈاکٹر مشیر الحق ندوی کا مقالہ "پروفیسر کانٹ ویل اسمتھ"	۵۹
مولانا تقی الدین ندوی کا تبصرہ	۶۵
ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ کا ایک سوال	۶۶
مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا اظہار خیال	۶۶
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تقریر	۶۷
سمینار کی تیسری نشست ۶۹ - ۹۲	
جناب عبدالواحد ہالی پوتا کا انگریزی......	۷۱
مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی تقریر	۷۴
مولانا علی میاں کی وضاحتی تقریر	۷۸
ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کا مقالہ "مستشرقین اور اسلام"	۷۹
مولانا سید سیاح الدین کاکاخیل کی تقریر	۸۵
ڈاکٹر گستاولی بان کی تمدن عرب پر	
ڈاکٹر محمد طفیل صاحب کا مقالہ "جوزف شاخت اور اصول فقہ"	۸۹
صدر جلسہ جناب سید حامد صاحب کا تبصرہ	۹۱
سمینار کی چوتھی نشست ۹۲-۱۰۸	
مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کا مقالہ	۹۲
مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی کے مستشرقین کے بارے میں تاثرات	۹۳
ظفر اسحاق صاحب کا تبصرہ	۹۵
مستشرقین پر سید صاحب کا اظہار خیال	۹۶
ڈاکٹر سید سلمان ندوی کی تقریر	۱۰۰
سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا اظہار خیال	۱۰۳
ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق کی تقریر	۱۰۴
حکیم محمد سعید کا شکریہ	۱۰۶
سمینار کی پانچویں نشست ۱۰۸ -	
ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا مقالہ	۱۰۸
جناب سید اطہر حسین صاحب کا مقالہ "قرآن اور مستشرقین"	۱۱۳
ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کا مقالہ "حدیث اور جوزف شاخت"	۱۱۵
ڈاکٹر اکمل ایوبی مسلم یونیورسٹی کا مقالہ "مغربی مستشرقین کے چند بنیادی مقاصد ان کی ترکی تاریخ کی روشنی میں"	۱۱۶
جناب قاضی زین العابدین صاحب کا مقالہ "ہمارے عصری تعلیمی اداروں پر مستشرقین کے اثرات"	۱۱۷
ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق کی اختتامی تقریر	۱۲۱
ڈاکٹر عبدالکریم ساتو کا خطاب	۱۲۳
علامہ یوسف القرضاوی کی پر اثر تقریر	۱۲۳
تجاویز	
آئندہ کاموں کے لیے ایک مجلس کی تشکیل	۱۲۶
سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی الوداعی تقریر	۱۲۸
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تقریر اور موثر دعا	۱۳۳
سمینار کا اختتام	۱۳۴

دیباچہ

۱۹۸۲ء میں دار المصنفین شبلی اکیڈمی میں اسلام اور مستشرقین پر جو سمینار ہوا تھا اس کی پوری روداد اس کتابچہ میں ہے، جو اس وقت ناظرین کے ہاتھوں میں ہے۔

اس کی اشاعت اور طباعت میں اس لیے دیر ہوئی کہ کوشش یہ تھی کہ اس کی چھپائی ونڈ ایک کے ذریعہ سے ہو، اس کی بعض ٹیکنیکی دقتوں کی وجہ سے اس کی پلیٹوں کی تیاری اور چھپائی میں کافی دیر ہوتی چلی گئی، جس کے لیے ہم ناظرین سے معذرت خواہ ہیں۔

آئندہ اس سلسلہ کی پانچ جلدیں بھی زیر طبع ہیں، دوسری جلد تو ان مقالات پر مشتمل ہے جو سمینار میں پڑھے گئے، ہندوستان اور باہر کے لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو تیسری جلد میں جمع کر دیا گیا ہے، علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر اپنی مختلف تحریروں میں جو کچھ لکھا اس کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے، یہ اس سلسلہ کی چوتھی جلد ہوگی۔

اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام اور مستشرقین کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا تھا وہ اس سلسلہ کی پانچویں جلد میں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔

زیر نظر جلد کی ترتیب میں مولوی حافظ عمیر الصدیق ندوی رفیق دار المصنفین نے کیسٹوں سے سمینار کی تقریروں کے قلم بند کرنے میں بڑی محنت کی ہے، اس لیے ان کو اس کتاب میں شامل کرنے میں اس سے بڑی مدد ملی۔

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

۲۴ر فروری ۱۹۸۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم معارف کے ذریعہ سے برابر اعلان کر رہے تھے کہ ۲۱/۲۲/۲۳ فروری ۱۹۸۲ء کو دارالمصنفین میں ایک بین الاقوامی سمینار ''اسلام اور مستشرقین'' پر ہونے والا ہے، الحمد للہ کہ ان تاریخوں میں یہ بہ خیر وخوبی انجام پا گیا۔

اس کے شروع ہونے سے پہلے برابر یہ خیال رہا کہ اس دور افتادہ شہر میں بیرونی ممالک کے لوگوں کو آنے میں بڑی تکلیف ہوگی، اس لیے وہ یہاں نہ آسکیں گے، لیکن جب فضل خداوندی شامل حال ہو تو پھر ہر قسم کی رکاوٹ خود بہ خود دور ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ توقع سے زیادہ مندوبین باہر سے پہنچے، قطر سے شیخ عبداللہ یوسف القرضاوی نے اپنی تشریف آوری سے اس اجتماع کو رونق بخشی، وہ قطر یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی فیکلٹی کے صدر اور مشہور مصنف ہیں اور بہ قول مولانا ابوالحسن علی ندوی فکر صحیح اور جذبۂ اسلامی کے لیے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، وقار اور متانت کے پیکر نظر آئے، ان کے ساتھ اس یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب اور ایک دوسرے استاد علی محمد یوسف المجدی تھے، رابطۂ اسلامیہ مکہ معظمہ کا بھی ایک وفد آیا، اس کی قیادت اس کے ڈائرکٹر جنرل شیخ عبدا لصبو رمرزوق کر رہے تھے، جن کی جاذب اور متحرک شخصیت توجہ کی مرکز بنی رہی، ان کے ایک رفیق بہت ہی بے تکلفی سے انگریزی بولتے تھے، ابوظہبی سے رئیس قسم الشریعہ بکلیۃ الحقوق والشریعۃ بجامعۃ الامارات العربیۃ المتحدہ استاذ محمود الطنطاوی اور دکتور تقی الدین الندوی المظاہری استاذ شعبۂ حدیث عین یونیورسٹی اور مشیر علمی اسلامی کورٹ آئے، مدینہ یونیورسٹی سے دینیات اور اسلامیات کے دو اساتذہ بھی شریک ہوکر اپنے ساتھ برکتیں لائے، طہران یونیورسٹی سے ڈاکٹر ظفر اسحاق پروفیسر تاریخ اسلامی جامعۃ البترول والمعاون مع اپنی بیگم کے اپنی نیکی، بھلمنساہت اور شرافت اخلاق کے ساتھ آئے، بنکاک (تھائی لینڈ) سے جناب ابراہیم قریشی سکریٹری جمعیۃ الاسلام اپنے دو رفقا، رحیم شاہ اور سکندر خاں کے ہم راہ عجز وانکسار کے تحفے لے کر آئے، جاپان سے عبدالکریم ساتو نے اس میں

شرکت کر کے اسلام کی عالم گیر برادری کا ثبوت دیا، استاذی المحترم جناب مولانا سید سلیمان ندویؒ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر سید سلمان ندوی ہمہ تن نیاز بن کر جنوبی افریقہ کی ڈربن یونیورسٹی سے پہنچے تو اپنے والد بزرگ وار کی یادوں کی مشعل روشن کرتے رہے، کراچی سے حکیم محمد سعید دہلوی (ہمدرد فونڈیشن) اپنی بے داغ بلکہ بلوری شیشے سے زیادہ چمک دار سفید شیروانی میں دارالمصنفین کے احاطہ میں داخل ہوئے تو ایسا معلوم ہوا کہ یہاں سہانی چاندنی چھنک رہی ہے، ان کے ساتھ ڈاکٹر فرید الدین بقائی بھی تھے، جو کراچی کے کام یاب ترین ڈاکٹروں میں ہیں، کراچی کے ان مہمانوں کی معیت میں حکیم نعیم الدین زبیری بھی تھے اسلام آباد (پاکستان) سے وہاں کے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب عبدالواحد ہالی پوتہ اپنے چھ رفقائے کار کے ساتھ آ کر اپنے حسن خلق، پاکی طینت، عجز و انکسار کے نقوش چھوڑ گئے، ان کی معیت میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی بھی تھے جو بین الاقوامی المجمع الفقہی، رابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کے رکن اور موتمر اسلامی کے اعزازی ڈائرکٹر جنرل بھی ہیں، علمی، فقہی، ادبی اور دینی معلومات کے بحر زخار ہیں، بولتے ہیں تو بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے ہیں، اس وفد میں ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی بھی شریک تھے، جو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ فکر و نظر کے بہت ہی لائق مدیر ہیں، آج کل بڑی محنت بلکہ عرق ریزی سے مولانا حمید الدین فراہیؒ کے قرآنی علوم پر کام کر رہے ہیں، اس علمی قافلہ کے ساتھ ڈاکٹر محمد طفیل ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے دارالمصنفین آ کر اس ادارہ اور میری حقیر ذات سے اپنے گہرے لگاؤ اور تعلق کا ثبوت دیا، جناب محمد احمد غازی ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو دارالمصنفین کے ذرہ ذرہ سے محبت نہیں بلکہ والہانہ عشق ہے، جس کا اظہار اسلام آباد سے اعظم گڑھ تک کی راہ نوردی میں کیا، اس علمی کارواں میں ڈاکٹر احمد خان لائبریرین اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو دارالمصنفین کی مطبوعات اور خصوصاً رسالہ معارف سے ایسی غیر معمولی محبت ہے کہ یہاں کی تصانیف اور معارف کے مضامین کے اسمائے معرفہ کے اوپر جو ایک ہلکی سی لکیر بنا دی جاتی تھی اور بعد میں ترک کر دی گئی، تو اس سے ان کو دکھ ہوا اور شکوہ سنج ہوئے کہ وہ اب کیوں نہیں ہوتی ہیں، وہ تو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں، اسلام آباد سے اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن مفتی سیاح الدین کاکاخیل بھی تشریف لائے اور اپنی قد آور شخصیت اور پاٹ دار آواز سے ہر جگہ

چھائے رہتے، لاہور سے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مدیر جناب نذیر حسین سفر کی بڑی صعوبتیں برداشت کرکے دوروز دیر کرکے پہنچے، مگر دارالمصنفین سے اپنی غیر معمولی محبت وعقیدت کے گلدستے نذر کر گئے۔

ہندوستان سے جناب حکیم عبدالحمید صاحب (ہمدرد دواخانہ دہلی) اپنی پوری عظمت وسطوت کو اپنی جلو میں لے کر جناب اوصاف علی ڈائرکٹر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہمدرد نگر تغلق آباد کے ساتھ رونق افروز ہوئے، جناب حکیم صاحب ہماری مجلس انتظامیہ کے معزز رکن بھی ہیں، جناب اوصاف علی ان کے ساتھ آئے تو گویا انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہمدرد نگر بھی کھینچ کر دارالمصنفین چلا آیا تھا، دہلی سے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن (۱) اپنی پیرانہ سالی اور کم زوری صحت کے باوجود دارالمصنفین کی محبت میں سفر کی ساری مشکلات کو طے کرکے تشریف لائے اور دکھ ہے کہ جب واپس ہورہے تھے تو بارہ بنکی کے پاس ریل ہی میں ان پر فالج کا اثر ہوگیا، یہ ہمارے سمینار کا ایک الم ناک پہلو ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو جلد صحت کلی عطا فرمائے تاکہ وہ تادیر قوم وملت کی خدمت کرسکیں، دہلی ہی سے مولانا ابواللیث ندوی امیر جماعت اسلامی نے تشریف لاکر اپنی اس محبت کا ثبوت دیا جوان کے دل میں بچپن سے دارالمصنفین کے لیے جاگزیں ہے، وہاں سے مولانا سجاد حسین صدر مدرس مدرسہ فتح پوری بھی یہاں آئے، تو ان کی دل کش اور رعنا شخصیت دیدہ زیب بنی رہی، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر امیر حسن عابدی صدر شعبہ فارسی بھی آئے جو سمیناروں کے مرد میدان ہیں، اسی یونیورسٹی سے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (شعبۂ اردو) بھی یہاں آکر اس بزم میں شریک ہوئے، وہ اپنے مخصوص طرز نگارش سے ہر اس موضوع میں جان ڈال دیتے ہیں جس پر ان کا قلم چل نکلتا ہے، جامعہ ملیہ دہلی سے جناب ضیاء الحسن فاروقی، ڈاکٹر مشیر الحق ندوی، ڈاکٹر حافظ محمد شعیب، ڈاکٹر عماد الحسن فاروقی اور جناب عبداللطیف اعظمی نے یہاں آکر اپنے اس دیرینہ تعلق کا ثبوت دیا جوان کو اس ادارہ سے ہے، جناب ضیاء الحسن فاروقی، سید شہاب الدین دیسنوی اور سعید انصاری صاحبان ہماری مجلس انتظامیہ کے ارکان میں سے ہیں، اس لیے

(۱) افسوس کہ اب مولانا اس دنیا میں نہیں رہے۔

یہ حضرات سمینار کے انتظام کے لیے کچھ دنوں پہلے آ گئے تھے اور بڑی محنت سے ہر کام میں جناب عبداللطیف اعظمی کے ساتھ رواں دواں رہے، جناب ضیاء الحسن فاروقی سمینار میں جب اپنے خوب صورت اور مؤثر انداز میں مقالہ پڑھتے ہیں تو حاضرین کو محظوظ کئے بغیر نہیں رہتے، ڈاکٹر مشیر الحق ندوی ابھی جوان ہیں، ان کی مقالہ نگاری میں جوانی کی ساری امنگیں اور ترنگیں ہوتی ہیں، ڈاکٹر عماد الحسن جناب ضیاء الحسن فاروقی کے فرزند ارجمند ہیں، خدا کرے ان کو اپنے والد بزرگ وار کی ساری خوبیاں عطا ہوں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب بھی تشریف لائے، اعظم گڑھ کے لوگوں اور خصوصاً مسلم یونیورسٹی کے یہاں کے اولڈ بوائز نے ان کی جس طرح پذیرائی کی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ نسیم نو بہاری بن کر آئے تھے اور جب وہ واپس ہوئے تو لوگوں کی زبان پر تھا کہ اپنے اخلاق کے گل وصنوبر کا ایک گلشن آباد کر گئے ہیں، مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے یہاں آکر خاص طور سے مجھ کو نوازا، وہ اس وقت تاریخ مشائخ چشت کا سلسلہ مرتب کر کے تصوف کے تخت طاؤس پر بیٹھ کر صاحب قرانی کر رہے ہیں

علی گڑھ ہی سے فاضل اجل جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی اڈیٹر برہان بھی تشریف لائے، یہ جہاں جاتے ہیں اپنے علم وفضل، قوت گویائی، یگانگت، موانست اور محبت کے شیش محل کی بنا ڈال دیتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر محمد اقبال انصاری بھی آئے، جن کو سمینار کی تقریبوں کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کا بڑا ملکہ ہے، ان سے طے تھا کہ وہ یہاں آکر اس تقریب کو ہر طرح کام یاب بنانے میں مدد کریں گے، ان ہی کے شعبہ کے ریڈر ڈاکٹر اکمل ایوبی بھی آئے، جو مختلف سمیناروں میں برابر بلائے جاتے ہیں، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر نہ آسکے تو ان کی نمائندگی اس شعبہ کے استاذ جناب اجمل ایوب اصلاحی نے کی، جن کا تقرر مدینہ یونیورسٹی میں ہو چکا ہے اور وہ وہاں جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں، میرٹھ سے جناب مولانا قاضی زین العابدین سجاد اپنے صاحب زادے زین الساجدین استاذ شعبۂ

دینیات مسلم یونیورسٹی کے ساتھ شریک ہوئے تو ان کی ہر گفتگو سے ان کے علم وفضل کا اظہار ہوتا تھا، لکھنؤ یونیورسٹی سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے دو داماد اور بھتیجے حکیم عبدالقوی دریابادی اڈیٹر ''صدق جدید'' اور جناب حبیب احمد قدوائی نے بھی آ کر گویا اپنے فاضل اجل چچا مرحوم کی نمایندگی کی، لکھنؤ سے جناب علی جواد زیدی چیرمین اتر پردیش اردو اکیڈمی نے آ کر مجھ کو خاص طور سے رہین منت کیا، یادش بہ خیر جناب خلیل الرب صاحب سابق ڈپٹی ڈائرکٹر اردو سیکشن یوپی گورنمنٹ پندرہ روز پہلے الٰہ آباد سے یہاں آ گئے تھے، ان کو چمن بندی کا بڑا اچھا سلیقہ ہے، یہاں کے پھولوں اور پودوں کو سجا کر اپنے حسن ذوق کا ثبوت دیا، پھر اس تقریب کے ہر کام کو ایسی دل سوزی سے انجام دینے کی کوشش میں لگے رہے، جیسے یہ ان کا اپنا ادارہ ہے، کچھ دنوں پہلے وہ اعظم گڑھ میں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں رہ چکے ہیں، اس لیے یہاں کے ہر طبقہ میں روشناس اور مقبول رہے، الٰہ آباد سے وہاں کی یونیورسٹی کے استاذ جناب طفیل احمد مدنی نے بھی آ کر شرکت کی، وہ اس موقع کے لیے ایک نظم لکھ کر لائے تھے۔

بھوپال سے اپنی کرم گستری سے حضرت سعید میاں سجادہ نشین خانقاہ یعقوبیہ، مجددیہ سلسلہ کی تمام برکتیں ساتھ لے کر تشریف لائے، وہیں سے برادر عزیز جناب حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی اپنے فرزند ڈاکٹر محمد حسان کو ساتھ لے کر پہنچے، انہوں نے کچھ دن پہلے اپنی ایک آنکھ کا آپریشن کرایا تھا، وہ ہماری مجلس انتظامیہ کے معزز ترین اراکین میں ہیں، دارالمصنفین کی ہر قسم کی سرگرمیوں میں ساتھ رہے ہیں، اس اجتماع میں شریک ہونے کے لیے بے تاب تھے، اس کی بے تابی میں اپنی آنکھوں کی تکلیف کی پرواہ کیے بغیر یہاں آ کر ہماری ہمت افزائی اور دل جوئی کی، پٹنہ سے خدابخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے بھی شرکت کی جو سمینار میں اپنے سوالات سے ہلچل اور گرمی پیدا کر دیتے ہیں، دربھنگہ سے ڈاکٹر عبدالعزیز سلفی دارالمصنفین کی محبت میں کھنچ کر پہنچے، گیا سے عزیزی سید اشہد علی ایڈوکیٹ آئے تو اپنے والد مرحوم جناب سید ریاست علی ندوی سابق رفیق دارالمصنفین کی یادوں کو تازہ کر گئے، اندور سے جناب عبدالحمید اور کالی کٹ سے ڈاکٹر سید قدرت اللہ بقائی صدر شعبۂ اردو فاروقی کالج دور دراز سفر کی زحمت گوارا کر کے اس اجتماع میں شریک ہوئے، کشمیر سے جناب عبدالرحمٰن کوندو برفستانی راستے طے کر کے دارالمصنفین کی محبت میں کشاں کشاں

آئے، وہ اس ریاست کے صاحب ذوق اہل علم اور باہمت معاشرتی کارکن ہیں، بھڑوچ سے مولوی غلام محمد واسطی نے بھی آنے کی تکلیف گوارا کی، بمبئی سے مولانا محمد مستقیم ندوی قاسمی بھی دارالمصنفین کی بے پناہ والہانہ محبت کے ساتھ آئے، ان کی معیت میں پندرہ آدمی اور تھے، بمبئی سے ہماری مجلس انتظامیہ کے رکن رکین سیٹھ عبدالعزیز انصاری دس روز پہلے اعظم گڑھ تشریف لائے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے، مئو سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی تشریف نہیں لاسکے، کیوں کہ ان ہی دنوں ان کو دل کا دورہ پڑا، جس سے ہم ان کی تشریف آوری کی برکت اور ان کی علمی فضیلت کی رونق سے محروم رہے، ملک کے مشہور عالم اور مصنف مولانا قاضی اطہر مبارک پوری سمینار سے پہلے برابر یہاں تشریف لاکر اپنے عالمانہ اور مخلصانہ مشوروں سے مستفید کرتے رہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اسٹاف اور طلبہ کی بڑی تعداد اس مذاکرہ میں شرکت کے لیے کیا بلکہ اس اہم موقع پر دارالمصنفین پر نچھاور ہونے کے لیے آئی، اس کے انعقاد سے دس روز پہلے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے محبوب بھانجے اور مولانا رابع ندوی کے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی کی وفات ہوگئی، تو اس سے دارالمصنفین کے خدمت گزاروں پر بجلی گری، خیال ہوا کہ اس الم ناک حادثہ کے بعد اس مذاکرہ کو ملتوی کردینا ہی بہتر ہوگا مگر مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا رابع ندوی دونوں نے اپنے بے مثال صبر وضبط سے کام لے کر ایسا ہونے نہیں دیا اور ندوۃ العلماء کے پینتیس طلبہ کو ان کے استاذ مولانا محمود الازہار، مولانا فاروق بھٹکلی، مولانا ابوسحبان کی نگرانی میں جلسہ گاہ کی زینت وآرائش کے لیے بھیجا، وہ آئے تو مندوبین کے لیے خوب صورت اور دیدہ زیب فائل مختلف قسم کے بیج، زیب و زینت کے سامان اور موقع کے لحاظ سے ہر قسم کے لٹریچر اور پمفلٹ اپنے ساتھ لائے، جن سے مذاکرہ میں وزن، وقار اور حسن بھی بڑھا، وہ منظر بھی عجیب وغریب تھا جب یہ طلبہ اپنے سروں اور کاندھوں پر کرسیاں، میزیں، قالین اور فرش ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہوئے دکھائی دیتے، پھر اپنی محنت اور خوش سلیقگی سے جناب محمود الازہار کی ہدایت سے کھلے اجلاس کے پنڈال اور مجلس مذاکرہ کے اسٹیج کو جنت نگاہ بنادیا اور جب مولانا سعید الاعظمی، مولانا ابوالعرفان، مولانا محبوب الرحمٰن، مولانا شمس الحق، مفتی محمد ظہور، مولانا محمد مرتضٰی، مولوی سلمان، افتخار احمد اور مولوی محمد رضوان وغیرہ پہنچے تو گویا

دار العلوم ندوۃ العلماء دار المصنفین کے احاطہ میں منتقل ہوگیا، ان تمام حضرات نے اپنی ہر امکانی کوشش سے اس تقریب کو کام یاب بنانے کی کوشش کی، مولانا سعید الاعظمی اور مولانا شمس الحق تو کبھی جگنو، کبھی چھلاوہ اور کبھی برق جمال کی طرح چمکتے دکھائی دیتے۔

اس شہر میں قیام گاہ کی بڑی دقت تھی، یہاں اچھے ہوٹل نہیں، اس مجبوری کی وجہ سے مہمانوں کو سونس کالج کے خیموں میں ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا، ان خیموں کی فراہمی میں جناب اطہر حسین صاحب آئی اے ایس نے غیر معمولی مدد پہنچائی، وہ ہماری مجلس انتظامیہ کے اہم رکن بھی ہیں، وہ اگر لکھنؤ میں اپنے غیر معمولی اخلاق اور اخلاص سے اثر انداز نہ ہوتے تو اتنے خیموں کا فراہم ہونا آسان نہ تھا، اس کے لیے ہم ان کے بہت ممنون ہیں، چالیس خیموں اور پنڈال وغیرہ کے لیے ایک بڑے میدان کی ضرورت تھی، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے سکریٹری جناب امتیاز احمد صاحب ایڈوکیٹ نے کالج کا میدان، اس کے کمرے، فرنیچر اور ہر چیز کو استعمال کرنے کی اجازت دے کر ارباب دار المصنفین کو ممنون کیا، کالج کے پرنسپل جناب محمد محسن عثمانی اور ان کے پورے اسٹاف نے اس موقع پر جس طرح تعاون کیا اس کے لیے بھی ہم ان کے شکر گزار ہیں، کالج کے جناب محمد غوث عالم (وائس پرنسپل) جناب اشفاق احمد (پروکٹر) جناب حماد عباسی (شعبۂ انگریزی) جناب ڈاکٹر محمد عرفان (شعبۂ اردو) ڈاکٹر انصار بیگ (شعبۂ حیوانیات) جناب وسیم الحسن (شعبۂ نفسیات) جناب وسیم احمد (شعبۂ جغرافیہ) ڈاکٹر رحمت اللہ (شعبۂ ہندی) ڈاکٹر نیاز احمد (شعبۂ تعلیمات) ڈاکٹر محمد صفی، ڈاکٹر مسیح الرحمٰن (شعبۂ علم الکیمیا) جناب محمد مشتاق اور ظفر فیضان (شعبۂ ریاضیات) جناب مسعود حسن اور مختار احمد (شعبۂ تعلیمات) اور ڈاکٹر محمد جمال (شعبۂ نفسیات) اور غیر تدریسی اسٹاف میں نیاز احمد اور ودود احمد نے پوری تن دہی اور دل سوزی سے اس مذاکرہ کو کام یاب بنانے کی کوشش کی، اسی طرح شبلی انٹر کالج کے سکریٹری جناب مرزا امتیاز احمد بیگ ایڈوکیٹ نے شروع ہی سے ہمارے ہر کام میں پورا تعاون کیا، اس کے پرنسپل جناب حکیم الدین اور وہاں کے اساتذہ میں داکٹر نیاز داؤدی، جناب عشرت علی، محمد اجمل انصاری، حسن اعجاز، محمد مسلم اور شاہد کلیم صاحبان بڑی محنت اور مشقت سے اس کے چھوٹے بڑے کاموں میں لگے رہے، خورد و نوش کے اہتمام کے ہیرو ڈاکٹر محمد طاہر (شعبۂ اردو شبلی کالج) رہے،

جنہوں نے بہتر سے بہتر کھانے پکوا کر مہمانوں کے کام ودھن کی لذت کا سامان کیا، ان کی خوش سلیقگی کی داد تمام بیرونی مہمانوں نے بھی دی، ان کے چچا مولوی عبدالباقی اصلاحی، کالج کے افضال احمد، شفقت علاء الدین اور اسکول کے جناب شاہد احمد خاں نے ان کو ہر قسم کی مدد پہنچائی، شبلی کالج کے شعبۂ اردو کے طلبہ نے اس تقریب کو اپنی تقریب سمجھ کر اس کو کام یاب بنانے میں پوری جاں فشانی کا ثبوت دیا، شبلی کالج کے ڈاکٹر قمر الدین (شعبۂ نباتیات) نے بڑی فراخ دلی سے اپنا پورا مکان مہانوں کے قیام کے لیے پیش کیا، جس سے بڑی سہولت رہی۔

شہر کے معززین میں جناب مبین الدین (سابق پروفیسر قانون شبلی کالج) جناب معین الدین (ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر) جناب امجد علی غزنوی وکیل (نائب صدر مجلس انتظامیہ شبلی کالج) جناب شاہ خالد وکیل، جناب محمد ایوب (ہمہ کمپنی) مولوی عزیز الرحمٰن سابق استاذ (شبلی اسکول) ڈاکٹر محمد سلیم، ایم ڈی، شروع سے مفید مشورے دے کر حوصلہ افزائی کرتے رہے، شاہ خالد نے سمینار کی ابتدائی دوراتیں جاگ کر گزاریں، اظفر فیضان اور مشتاق احمد صاحبان (شعبۂ ریاضیات) سایہ کی طرح برابر ساتھ رہے۔

پھر ہماری مجلس انتظامیہ کے مقامی اراکین میں جناب مرزا نیاز احمد بیگ وکیل اور جناب شوکت سلطان صاحب نے وہی سارے حقوق ادا کئے جو ان کو کرنا چاہئے تھے، جناب مرزا امتیاز احمد بیگ تو ہر موقع پر میرے دوش ناتواں کو سنبھال کر میرے دل کو اپنے ہاتھوں میں لیے رہے، جناب شوکت سلطان صاحب لکھنؤ کے سفر میں برابر ساتھ رہے، ان ہی کی مساعی جمیلہ سے یوپی حکومت کے وزیر جناب عمار رضوی اس موقع کی علمی نمائش کے افتتاح کے لیے تشریف لائے، ان ہی کی سفارش پر تین دن بجلی کی روشنی کا اچھا انتظام رہا، اس کے لیے ہم مجلس قانون ساز کے پھولپور اعظم گڑھ حلقہ کے ممبر جناب ابوالکلام کے بھی ممنون ہیں کہ انہوں نے لکھنؤ میں بیٹھ کر ہر قسم کی امداد کی۔

اعظم گڑھ کے جناب راجہ اعظم خاں کے پوتے نیر اعظم بھی سایہ بن کر ساتھ رہے، مہمانوں کے ٹرانسپورٹ کا بڑا اچھا انتظام کیا، انہوں نے اظفر فیضان کے ساتھ مل کر میونسپلٹی اور بجلی کے محکموں کی طرف سے صفائی ستھرائی اور روشنی کا خاطر خواہ انتظام کیا، اس کے لیے ہم ایگزیکیٹو آفیسر چھمی چند کول اور سینٹری انسپکٹر محمد صدیق ہاشمی کے بھی شکر گزار ہیں۔

ضلع کے حکام میں جناب کلکٹر اور کپتان صاحب نے بھی ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے میں خیموں کے لیے محافظ دستے بھی بھیج کر ممنون کیا، دارالمصنفین کے خدمت گزاروں نے تو اپنی جان کی بازی لگادی تھی، ہر فرد متحرک تھا، اس کے رفقا میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز، حافظ منصور نعمانی، حافظ محمد عمیر اور کتب خانہ کے مولوی عبدالباری اور محمد اسحاق ادیب نے مل کر بہت ہی عمدہ علمی نمایش سجائی تھی، جو مہمانوں کے لیے بہترین علمی اور ثقافتی ضیافت ثابت ہوئی، ان کی مدد کے لیے جناب الحاج مولوی ابوالبقا ندوی مدعو کر لیے گئے تھے، وہ پہلے دارالمصنفین ہی سے منسلک تھے، اب مبارک پور میں طبابت کرتے ہیں، وہ تقریباً پندرہ روز پہلے آ گئے تھے، اپنی انتھک محنت اور ہر کام کو انجام دینے کی صلاحیت سے ہر کس و ناکس کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا جو کام مشکل نظر آتا، اس کو وہ بہت ہی خندہ پیشانی سے انجام دے دیتے، اس موقع پر خاص طور سے مولوی احتشام علی ندوی بلا لیے گئے تھے جو پہلے ہمارے دفتر میں رہ چکے ہیں، انہوں نے اخراجات کے حساب کتاب اور دوسرے مالی امور میں دفتر کے خزانچی مشہور اویس کی بڑی مدد کی اور دوسرے انتظامی کاموں کو بھی سلیقہ سے انجام دیتے رہے، ہمارے رفیق کار جناب محمد مجید زبیری صاحب اپنی علالت کے باوجود سارے انتظامی امور کے بار کو عمدگی سے سنبھالتے رہے، پریس کے عملہ میں منشی محمد اقبال، محمد انوار خاں اور مولوی ابوالحسنات نے اس موقع پر اپنی خطاطی کے اچھے نمونے پیش کئے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کا پروگرام تھا کہ وہ سمینار کے شروع ہونے سے تین روز پہلے ہی تشریف لائیں گے، مگر اپنے عزیز بھانجے کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے ۲۰ر فروری کی شام گزار کر رات کو مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلما اور مولانا محمد رابع ندوی کے ساتھ دارالمصنفین میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ سمینار کی تقریب کے جسم میں ایک سحر آفریں اور عطر آگیں روح منتقل ہوگئی ہے، پورا احاطہ روشنی سے جگمگا رہا تھا، لیکن ان کی تشریف آوری سے علم و فن کی کرنیں ہر طرف پھوٹتی نظر آنے لگیں، مولانا رابع ندوی کا دل اپنے عزیز بھائی کی دائمی جدائی سے سوگ وار اور رنجیدہ رہا، مگر وہ اپنے پریم بیتی کے ساتھ آئے، اور زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ یہ مذاکرہ کام یاب ہو کر رہے گا، ان حضرات کے آنے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوا کہ میرے جسم کے اندر ایک بہت ہی طاقت ور ڈائنمو

نصب کر دیا گیا ہے، پھر تو ہر قسم کی حرکت اور سرگرمی میرا ساتھ دے رہی تھی۔

۲۱ر فروری کو تقریباً دس بجے دن کو ایک مرصع پنڈال میں مذاکرہ کا افتتاح ہوا، اس کی صدارت قطر یونیورسٹی کے شیخ یوسف عبداللہ القرضاوی نے کی، ان کے پہلو میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوئے تو ظاہر ہو رہا تھا کہ علم کے آسمان پر سے برج عطارد نیچے آگیا ہے، اور دوسرے سیارے اس کے اردگرد جمع ہیں، مولانا محمد رابع ندوی کو کاروائی کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری سپرد کی گئی، جس کو انہوں نے پوری خوش سلیقگی اور مہارت سے انجام دیا۔

جلسہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک انڈونیشی طالب علم فہمی زمزم کی پر اثر تلاوتِ کلام پاک سے شروع ہوا، پھر مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ان بیرونی اور ملکی مندوبین کے نام پڑھ کر سنائے جو اس وقت جلسہ میں موجود تھے، اس کے بعد ابوظبی کے چیف جسٹس شیخ احمد بن عبدالعزیز المبارک کا پیام مولانا تقی الدین ندوی نے پڑھ کر سنایا، پھر مراکش یونیورسٹی کے عربک اسٹڈیز کے ڈین کا پیام دارالعلوم ندوۃ العلما کے مولوی سلمان ندوی نے پڑھا، آخر میں دکتور معروف الدوالیبی سابق وزیراعظم شام و مشیر شاہ خالد سعودی عرب کے ایک خط کا متن مولانا سعید الاعظمی نے پڑھا اور اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے سنایا۔

پھر یہ خاک سار اسٹیج پر مہمانوں کا اپنی ایک تحریر کے ذریعہ سے خیر مقدم کرنے کے لیے حاضر ہوا، علامہ شبلی نعمانیؒ اور ان کے جانشین استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مستشرقین کو سمجھنے کے لیے جو اہم اور بنیادی باتیں اپنی زندگی میں بتائی تھیں، ان کی طرف اس تحریر میں خاص طور پر توجہ دلائی گئی، اس لیے اس کا پورا متن یہاں درج کرنا مناسب ہوگا۔

''صدر محترم!

دارالمصنفین کی طرف سے اس مذاکرہ کے لیے اپنے عزیز مہمانوں کا دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کرتا ہوں، ارباب علم و دانش کے اس شان دار اجتماع کو دیکھ کر جہاں ہمیں فخر ہو رہا ہے، وہاں ہمارے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر اور ایک مدت کی آرزو آج پوری ہو رہی ہے، جن مقاصد کے تحت دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا، ان میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دین اسلام، سیرۃ نبویؐ اور اسلامی علوم و

فنون کے متعلق جو تحقیقات ہوتی رہتی ہیں اس کا جائزہ لیا جاتا رہے، جہاں اور جو کام اچھا دکھائی دے اس کی داد دی جائے اور جہاں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کوئی غلطی نظر آئے اس کی نشان دہی خالص علمی اور تحقیقی رنگ میں کی جائے۔

جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے، ان سے متعلق ہمارے اس ادارہ کے بانی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے لیے رہنما اصول بتا گئے ہیں، اس موقع پر مختصر طریقے سے ان کے خیالات دہرانے کی اجازت چاہتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

یہ مستشرقین تین قسموں میں منقسم کیے جاسکتے ہیں:

(۱) جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایۂ معلومات اوروں کی تصانیف اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ مشتبہ اور نامکمل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔

(۲) بعض مستشرقین عربی زبان، علم و ادب، تاریخ اور فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے نا آشنا ہیں، وہ سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھتے، لیکن ضمنی طور پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمنی کے مشہور فاضل ساخو نے طبقات ابن سعد شائع کی تو اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کرسکتا ہے، لیکن جب وہ اسلامی امور کے متعلق باتیں لکھتا ہے تو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے یا کوئی اور۔ نولدیکی نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے، لیکن انسائیکلوپیڈیا میں قرآن پر جو اس کا آرٹیکل ہے، جا بہ جا نہ صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

(۳) وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر یا مارگولیتھ سے ہم کچھ امید کرسکتے تھے، لیکن وہ باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ اور تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ ع

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیتھ نے مسند امام حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہم سری کا دعویٰ نہیں ہوسکتا لیکن اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب، افترا، تاویل اور تعصب کی مثال کے لیے پیش نہیں کرسکتی، اس کا کمال یہ ہے کہ جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوسکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے، یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے، لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں، ان کی وجہ سے ہم ان کو معذور سمجھتے ہیں، سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحٰق، تاریخ طبری وغیرہ ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، آنحضرت ﷺ کے سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے زیادہ تر بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی ہے تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لیے کافی ہے، دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور اسلام کے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے، جو گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کرلی جائے گی۔

یہ وہ حقائق ہیں جو ہمارے ادارہ کے بانی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ہم کو بتا گئے ہیں، ان ہی کے شاگرد رشید اور جانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے پیچھے یہ وصایا چھوڑ گئے ہیں۔

یورپ کے اہل علم نے جہاں علوم جدیدہ کا سرمایہ فراہم کیا اور اپنے لٹریچر کو نئے نئے اسلوب میں شائع کیا، وہاں علوم اسلامیہ کی اہمیت نے بھی ان کے علمی شغف کو اپنی طرف مائل کیا اور مستشرقین کے نام سے ایک مستقل گروہ نے عربی علوم و ادب کی حفاظت و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا، ان کی یہ قابل قدر سرگرمیاں ہمارے شکریہ کی مستحق ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ علوم ان کے نہ تھے، اس لیے وہ ہم دردی اور محبت جو مسلمانوں کو اپنی چیزوں سے ہوسکتی ہے، ان کو نہیں ہے، اس لیے ان کی تحقیق و

تدقیق سے جہاں فائدہ ہو رہا ہے، سخت نقصان بھی پہنچ رہا ہے، جس کی تلافی آج مسلمان اہل علم کا فرض ہے، ان میں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اپنے مسیحی اور مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی علوم پر نظر ڈال کر تحقیق وریسرچ کے نام سے ایک نیا محاذ جنگ بنا کر اسلام، داعی اسلامؐ، اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب وتمدن پر بے پناہ حملے کر رہا ہے، قرآن مجید، حدیث، تصوف، سیر، رجال، کلام اور فقہ سب ان کی زد میں ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ یورپ کے اس رنگ کے لٹریچر سے اسلام کو کس قدر شدید نقصان پہنچا ہے اور پہنچے گا، اگر یہ زہر اسی طرح پھلتا رہا اور اس کا تریاق نہیں تیار کیا گیا تو معلوم نہیں کس حد تک نوجوان مسلمانوں کے دماغوں میں سمیت سرایت کر جائے گی۔''

دارالمصنفین کے بانی اور ان کے جانشین ہم کو جو پیام دے گئے ہیں، ہم اسی پر عمل کرتے رہے ہیں، آج کا یہ علمی مذاکرہ اسی سلسلہ کی ایک زرّیں کڑی ہے، ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ان دونوں بزرگوں کی روحیں اس اجتماع سے خوش ہو رہی ہوں گی وہ اور بھی خوش ہوں گی، جب اس میں مستشرقین کے زہر کا تریاق پورے طور پر پیش کیا جائے گا، جس سے امید ہے کہ پوری اسلامی دنیا بھی آگے چل کر مستفید ہوگی۔

آخر میں ایک بار پھر اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا شکریہ صمیم قلب سے ادا کرتے ہیں کہ اس دور افتادہ شہر میں آنے کی زحمت گوارا کر کے انہوں نے ہمارے ادارہ کو نوازا۔

اس کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنا استقبالیہ خطبہ زبانی دیا، وہ بول رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ فصاحت، طلاقت لسانی کا رس گھول رہی ہے، بلاغت چاندی کے سکوں کو کھنکھنا رہی ہے، شیرینی قلاقند کی مٹھاس سے کام ودھن کو لذت آشنا کر رہی ہے، یہ خطبہ عربی زبان میں تھا، لیکن اس کی ساری باتیں اردو میں کہی جا رہی تھیں، یہ تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا، اس کا پورا متن تو آئندہ شائع ہوگا، لیکن مستشرقین سے متعلق جو باتیں کہی گئیں، وہ اس وقت ہدیہ ناظرین ہیں، فرمایا:

اس بات کا اعتراف ہے کہ مستشرقین میں ایک بڑی اور خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے، جنہوں نے بڑا مفید کام انجام دیا اور جہاں تک ہمارا اندازہ ہے، انہوں نے اپنے علمی شغف، علم کی پیاس اور علم کی قدر وقیمت کے احساس کے تحت انجام دیا اور ان کی وجہ سے ہمارے اسلاف کی بعض

ایسی نادر کتابیں ہمارے سامنے آئیں کہ جن کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہوگئیں، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں حدیث، تفسیر، علوم عربیہ، سیرت اور تاریخ کا درس دینے والے یہ حسرت لے کر اپنے ساتھ دنیا سے چلے گئے کہ انھوں نے طبقات ابن سعد یا فلاں کتاب نہیں دیکھی تھی تو ہمیں مستشرقین کے اس احسان کو ماننا چاہئے اور یہی نہیں اگر خالص مستشرقین کا کوئی اجتماع ہوتا تو میں ایک مسلمان طالب علم، شمع علم کے ایک پروانہ اور چمن عمل کے ایک ادنی خوشہ چیں کی حیثیت سے اسی جرأت، اسی وضاحت بلکہ اسی خود اعتمادی کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا جیسا میں اپنے عزیز بھائیوں اور مہمانوں کے سامنے اس وقت کر رہا ہوں، لیکن اسی کے ساتھ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد نے قرآن، حدیث، سیرت، تمدن اسلام، اسلامی معاشرہ اور پھر اسلامی حکومتوں کی تاریخ کا مطالعہ ایک خاص مقصد کے تحت کیا، ان کی خوردبیں نگاہ وہ چیزیں تلاش کرتی رہی جن کو جمع کر دینے سے وہ قرآن، شریعت اسلامی، سیرت نبویؐ، قانون اسلامی، تمدن اسلامی اور سیاست اسلامی کی ایک ایسی تصویر پیش کرسکیں جس کو دیکھ کر لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ لیں اور ان کو اس سے گھن آئے، یہاں بڑے بڑے فضلا موجود ہیں، ہماری بہت سی یونیورسٹیوں کے شعبۂ تاریخ کے صدر اور ذمہ دار موجود ہیں، وہ جانتے ہیں کہ تاریخ و ادب میں اس بات کی کتنی صلاحیت ہے کہ آپ اس سے جو کام لینا چاہیں لے سکتے ہیں، دنیا کے بہت کم علوم ہیں جن میں اس کی صلاحیت ہو، یہ مواد خام ہے، آپ اگر اس سے شاہی محل تعمیر کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، آپ اگر اس سے غریب کا جھونپڑا بنانا چاہتے ہیں تو بنا سکتے ہیں، آپ اگر اس سے شاطرانہ سازش کا مرکز بنانا چاہتے ہیں تو بنا سکتے ہیں اور اگر بے ادبی نہ ہو تو آپ اگر اس سے کسی نجاست کی جگہ بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو اسی میں یہ سامان بھی مل جائے گا، یہ آپ کی نیت پر موقوف ہے اور آپ کی محنت پر بھی اور آپ کے سلیقہ اور ذہانت پر بھی اور ظاہر ہے کہ اس سلیقہ اور ذہانت کے بہت سے اسباب ہیں، جن میں کچھ طبعی، کچھ تاریخی، کچھ مذہبی، کچھ اخلاقی ہیں، کچھ کا تعلق یورپ کی ریاست و کلیسا کی آویزش اور پھر آخر میں جنگ صلیبی سے ہے، اس کو تخریبی اور سلبی ذہانت کہنا زیادہ بہتر ہوگا، یہ سلبی ذہانت ہمارے مستشرق فضلا میں بہ درجۂ تمام پائی جاتی ہے، انھوں نے اپنی آنکھوں پر خوردبین لگا کر تاریخ اسلام اور تمدن اسلامی اور پھر آگے بڑھ کر خاکم بدہن قرآن مجید اور سیرت نبویؐ میں وہ ذرّے اور

ریزے تلاش کرنے شروع کئے کہ جن سے کوئی جماعت اور شخصیت خالی نہیں ہوسکتی، ان کو جمع کر کے انہوں نے ایک ایسا مجموعہ تیار کرنا چاہا کہ جو ایک نہایت تاریک تصور ہی نہیں بلکہ تاریک تاثر اور تاریک جذبہ پیش کرے، ان کی مثال بالکل سینٹری انسپکٹر کی سی ہے، سینٹری انسپکٹر کسی گلزار سے گلزار شہر میں، خواہ اسلامی عہد کا قرطبہ ہو، غرناطہ ہو، بغداد ہو، دمشق ہو یا پھر دلی ہو، احمد آباد ہو، مغلوں کے زمانہ کا لکھنؤ ہو، یا پھر اس وقت کا لندن اور نیویارک ہو، سینٹری انسپکٹر کا کام یہ ہے کہ وہ ان جگہوں کو دیکھے، خاص طور پر جہاں پانی مر رہا ہے، جہاں سڑاند پھیل رہی ہے، جہاں نالیوں کا انتظام صحیح طور پر نہیں ہے، جہاں دلدلیں ہوگئی ہیں اور پھر وہ رپورٹ پیش کرتا ہے اور اس رپورٹ میں اس کی بے انصافی یا بدنیتی کو دخل نہیں ہوتا، اس کے فرض منصبی کا تقاضا ہے کہ جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے، اس کا فکری تقاضا ہے کہ وہ اپنی رپورٹ میں صرف اس گندی نالیوں، سنڈاسوں اور دلدلوں کا ذکر کرے جو اس گلزار شہر میں بہ مجبوری پائے جاتے ہیں، اس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ یہ بتائے کہ اس شہر میں کتنے خوش نما پارک، کیسے کیسے لہلہاتے باغ، کیسی کیسی چمن کی کیاریاں ہیں، کیسے کیسے کھلتے ہوئے پھول ہیں اور وہاں پر کیا قدرتی حسن پایا جاتا ہے، وہاں کیسے کیسے کتب خانے ہیں، اگر کوئی سینٹری انسپکٹر اس قسم کی رپورٹ دے تو شاید ہمیشہ کے لیے اس کو چھٹی دے دی جائے، حالانکہ یہ کوئی بری بات نہیں، اگر وہ کتب خانوں اور باغات کا ذکر کر دے، لیکن اس کو پرانی اصطلاح میں فضولی ایک دم فضولی سمجھا جائے گا، یہ اس کے فرض میں داخل نہیں، افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بہت سے مستشرقین نے سینٹری انسپکٹر کا فرض انجام دینا طے کر لیا ہے، انہوں نے خوردبین ہی سے نہیں بلکہ اپنی قوت شامّہ کو بھی صرف تعفن کا ادراک کرنے کے لیے استعمال کیا، تاریخ اسلامی اور بعثت نبویؐ سے لے کر زوال خلافت عثمانیہ اور اس کے بعد تک کا مطالعہ سینٹری انسپکٹر کی حیثیت ہی سے کیا اور انہوں نے صرف گندگی کی رپورٹ پیش کی، ہمیں اپنے مستشرق بھائیوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ ہمارے شریک سفر ہیں، ہم اور وہ دونوں بادیۂ علم کے رہ نورد ہیں اور ہمارا ان سے ایک رشتہ ہے، کاش میری یہ آواز جو یہاں آپ تک گونج کر رہ جائے گی، ان تک پہنچ سکتی تو میں ان سے کہتا کہ خدا نے آپ کو وہ صلاحیتیں عنایت فرمائی تھیں کہ اگر آپ ان سے اچھا کام لیتے، حسن بیں اور عیب چیں دونوں آنکھوں کو کھلا رکھتے، اپنی قوت شامہ کو آزاد چھوڑ دیتے، اس کو اس کا

پابند نہ کرتے کہ آپ صرف تعفن کو سونگھیں گے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو حاسۂ جمال اور ذوق جمال عطا فرمایا تھا، اس کو آپ مسیحیت، پاپائیت کی تاریخ اور سائنس کی ترقی اور جنگ صلیبی کی داستان لکھنے کے لیے ہی مخصوص نہ کر دیتے تو آپ یہاں سب کچھ پا سکتے تھے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ☆ ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

یہاں تو کلیوں کو دیکھا ہی نہیں گیا، یہاں تو صرف کانٹوں کو تلاش کیا گیا اور میں دعویٰ نہیں کرتا، علم کا تقاضا ہے کہ کوئی کلیہ کے طور پر کسی بات کا دعویٰ نہ کرے، لیکن یہ کہنا صحیح ہے کہ مستشرقین کی ایک بیشتر تعداد نے اور کم سے کم اس تعداد نے جو ہمارے سامنے ہے اور عالم اسلام کے سامنے جس کا تعارف ہوا، اپنی خوردبین سے تاریخ اسلام، حدیث اور علوم اسلامیہ، تمدن اسلامی اور اسلامی حکومتوں میں صرف عیب ہی عیب دیکھا، اسلام میں جمال بھی ہے، کمال بھی ہے اور نوال بھی ہے، مستشرقین نے ان تینوں چیزوں کو نظر انداز کر کے صرف معائب، صرف کم زور پہلو پیش کیے، میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گا اور نہ آپ اس کے لیے تیار ہوں گے، لیکن مستشرقین حضرات میں کئی بڑے نام ابھی علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اقتباس میں آچکے ہیں اور میرے خطبہ میں اس کا پورا جائزہ لیا گیا ہے، استشراق اور مستشرق پر ایک عام نگاہ ڈالی گئی ہے، تمام مغربی ممالک میں ان کے رویہ، ان کے ایڑی چوڑ کو بیان کیا گیا ہے، ان کی جو چیزیں ہمارے سامنے آئی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان طالب علم اپنے اصل سرچشموں سے واقف نہیں ہے اور اس کو خدا کی رہنمائی، تائید الٰہی اور توفیق الٰہی شامل نہیں ہے تو وہ ان مستشرقین کی کتابوں کو پڑھ کر صرف ایک خیال قائم کرے گا، جیسا کہ علامہ شبلیؒ نے کہیں لکھا ہے کہ اسلام قصائیوں کی ایک دوکان ہے، جس میں ہر وقت چھریاں چلا کرتی ہیں، یا ایک میدان جنگ ہے جس میں انسانوں کو شکار کیا جاتا ہے، یا ایک عشرت گاہ ہے جس میں صرف حرم سرا نظر آتی ہے، حرم کے لفظ کو مستشرقین نے بڑی اہمیت دی ہے اور اس کا خوب ڈھنڈورا پیٹا ہے، میرے فاضل اور محقق دوست علامہ بہجت البیطار نے کہا کہ جب میں امریکہ گیا تو ہر پڑھا لکھا امریکن دو باتیں پوچھتا تھا، تمہارے حرم سرا میں بیویاں کتنی ہیں اور تمہارے گھر میں اونٹ کتنے پلے ہیں؟ گویا مسلمان کا تخیل یہ ہے کہ اس کی متعدد منکوحات کا ایک حرم سرا ہونا ضروری ہے اور دوسری بات یہ کہ اونٹ نہایت مقدس

جانور ہے، قرآن شریف میں اس کا بار بار نام آیا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس پر سفر کیے ہیں اور مکہ سے مدینہ اسی پر ہجرت ہوئی ہے، اس لیے اونٹ پالنا ایک مقدس کام ہے، اس لیے ہر مسلمان جس طرح حج کرتا ہے اور تسبیح پڑھتا ہے، اسی طرح وہ اونٹ بھی پالتا ہے۔ آپ خیال فرمائیے کہ ان مستشرقین نے کیا معلومات دیں، یہ اپنے کو حقیقت پسند اور صداقت کا جویا کہتے ہیں، لیکن وہ مسلمانوں کی زندگی کا کیا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا، آپ خیال فرمائیں کہ ان مستشرقین نے ہمیں کیا معلومات دیں، وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ترقی یافتہ ملکوں میں رہنے کی حیثیت سے حقیقت پسند اور صداقت کے جویاں ہیں، مگر میں ان سے عربوں اور مسلمانوں کی طرف سے پوچھتا ہوں کہ انہوں نے عربوں کی کیا تصویر پیش کی، اسلامی تمدن کی کیا مرقع آرائی کی، اس کے اہم ارکان توحید، رسالت، نماز اور روزہ ہیں، ان کی کیا تشریح کی؟ انہوں نے صرف یہ بتانے کی کوشش کی کہ اسلام کے دو رکن ہیں، ایک حرم سرا اور ایک اونٹ، انہوں نے دو چار برسوں میں کیا کام کیا؟ سیل نے قرآن پاک کا ترجمہ کیا، پروفیسر اربری نے بڑی شہرت حاصل کی، منٹگمری واٹ آج کل بہت نمایاں ہیں، مگر انہوں نے کیا ذہنی تربیت کی؟ امریکہ عرب ملکوں اور خصوصاً مشرق وسطی سے متعلق بڑے بڑے فیصلے کر بیٹھتا ہے، مگر اسلام کے متعلق اپنے ملک کو کیا روحانی غذا فراہم کی، وہاں کا ایک متوسط درجے کا آدمی یہی سمجھتا ہے کہ اسلامی تمدن کے دو سمبل ہیں، ایک حرم سرا کی وسعت اور دوسرا اونٹوں کی کثرت، یہ انسانیت اور خود ان کے ملک کی سیاست کی کون سی خدمت ہوئی؟ فوج کہیں داخل ہوتی ہے تو پہلے ہراول یا طلیعہ بھیجا جاتا ہے، تا کہ فوج آگے بڑھے تو وہ ملک کے لوگوں کے مزاج، وہاں کی روایات، وہاں کی تہذیب اور وہاں کی زبان سے واقف ہو، تا کہ اس کو اندازہ ہو کہ وہ کس ملک میں قدم رکھ رہی ہے اور وہاں کے لوگوں سے کس طرح پیش آئے اور ان کے مسائل سے کس طرح نپٹے اور وہاں کے لوگوں سے کس زبان میں باتیں کرے، کیا ہمارے مستشرقین کا یہی رویہ رہا؟ میں آپ سے نہیں اپنے ضمیر سے معذرت کرتے ہوئے ایک تلخ حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں اور اس کے اظہار کے لیے ایسی موزوں جگہ ابھی تک نہیں ملی، مستشرقین کے ایک گروہ نے تخریبی اور سلبی فرض انجام دیا

ہے، ان کے دلوں میں صلیبی جنگ کی جو کدورتیں تھیں اس کی ہزیمت کے جو داغ تھے، انہوں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ اسلام جو ایک پیغام ہے، جو ایک زندۂ جاوید تحریک ہے، جو خود ایک زندگی ہے، اس لئے یورپ کو جس کے ہاتھ میں قیادت آنے والی تھی، محروم رکھا جائے، اس کی صحیح تصویر سامنے نہ آنے پائے یہ بہت بڑا ظلم ہوا، میں اس کا شاکی نہیں ہوں اور نہ یہ دائرہ اس کا شاکی ہے، بلکہ یورپ اور امریکہ کو شاکی ہونا چاہیے، ان کا دامن گیر ہونا چاہیے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ دور انصاف دور نہیں جب خود امریکہ اور یورپ کی عقلیت پسندی کے دور میں یہ حقیقت آشکارا ہوگی، یورپ کے حقیقت پسند معاملات کو ریاضی کے اصولوں بلکہ عملی اصولوں سے جانچنے کے عادی ہیں وہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مستشرقین نے انہیں کتنے دھوکے میں رکھا اور اسلام سے فائدہ اٹھانے سے روکا، روز حشر میں نئی نسل کے روشن ضمیر اور جری افراد کے ہاتھ ان مستشرقین کے دامن اور گریبان پر ہوں گے کہ انہوں نے لڑائیوں میں بے ضرورت مصروف رکھ کر ان کو غلط فہمیوں میں مبتلا رکھا اور صحیح حقیقت نہیں بتلائی۔

عالم اسلام میں چار ملک بلا واسطہ رو در رو مغربیت سے دوچار رہے، جب مغربیت کا لفظ بول رہا ہوں تو اس سے مغربی سیاست، مغربی طریق افکار، مغربی تصورات، مغربی جذبات اور احساسات مراد ہیں، ہاں تو جن چار ملکوں کا آمنا سامنا مغربیت سے ہوا، وہ ترکی، مصر، ہندوستان اور ایران ہیں، ان ملکوں میں مغربی زبانوں میں ہمارے مسلم فضلا کو بہت بڑا کام کرنا تھا، یہ فرض عین تھا، فرض کفایہ نہیں، بہت سے لوگوں کے حق میں فرض عین تھا، ورنہ فرض کفایہ بھی کم اہمیت نہیں رکھتا، ان کو سارے کام چھوڑ کر یہ فرض انجام دینا تھا تاکہ وہ اپنی نئی نسل کو ان سمی اثرات سے محفوظ رکھیں اور غذائے صالح مہیا کرتے رہیں، اس لیے کہ یہ تقدیر انسانی اور سنت الٰہی ہے کہ خلا نہیں رہ سکتا، خلا غیر طبعی ہے، کوئی ضرورت کی چیز مہیا نہ کی جائے تو آپ زیادہ دیر تک خلا باقی نہیں رکھ سکتے، آپ کسی کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی غذا کہیں اور سے حاصل نہ کرے، ضرورت اس کی تھی کہ ہمارے فضلا وہ غذائے صالح فراہم کر دیتے جس سے ہمارا نوجوان طبقہ مطمئن ہوتا اور وہ اپنے کو متعفن اور مسموم غذا کی طرف لے جانے پر مجبور نہ پاتا، لیکن افسوس ہے کہ جہاں تک میں واقف ہوں کہ کم سے کم ترکی، مصر اور ایران میں یہ کام بہ قدر ضرورت بھی نہیں ہو سکا، ترکی کا تعلق جرمن زبان، مصر کا پہلے فرنچ، پھر انگریزی اور ایران کا فرنچ

اور انگریزی دونوں سے رہا، جہاں تک میری معلومات ہیں، ان زبانوں میں ان ملکوں میں کوئی بڑا اور کوئی وقیع کام نہیں ہوا، عرب ممالک سے بھی بڑی کوتاہی ہوئی، وہ مغربی زبانوں میں وہ ٹھوس اور وقیع اسلامی لٹریچر پیش نہیں کر سکے جس کا نوجوان طبقہ بھوکا تھا بلکہ اس کے لئے وہ بے تاب تھا عربی زبان میں بے شک فرسٹ گریڈ کی چیزیں لکھی گئیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ترکی اور مصر میں ان موضوعات پر جن پر مستشرقین لکھ رہے تھے، کام نہیں ہوا اور ہوا تو وہ نا قابل ذکر ہے، یہ کہنے میں مجھے فخر ہو رہا ہے اور اس کے کہنے میں سب سے بہتر جگہ یہی ہے کہ کمیت، کیفیت، جوہر اور قدر و قیمت کے لحاظ سے سب سے زیادہ کام ہندوستان میں ہوا، گو مجھ کو اس کا بھی شکوہ ہے کہ جتنا عرصہ ہماری مسلمان نسل کو انگریزی زبان وادب میں مہارت پیدا کرنے کے لیے ملا، اس لحاظ سے کام تشفی بخش نہیں ہوا، اگر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۸۲ء تک کی مدت کو سامنے رکھیں تو اس طویل مدت میں جتنا کام ہونا چاہئے تھا نہیں ہو سکا، اس کے مقابلہ میں ہمارے قدیم مدرسوں کے علمانے ان زبانوں میں جن کے وہ ماہر تھے، زیادہ کام کیا اور جیسا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے میرے والد مرحوم کی کتاب یادِ ایام کا پیش لفظ لکھتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ ایک مولوی طبقہ کی پیشکش ہے، اب دیکھنا ہے کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ کیا نمونہ پیش کرتا ہے اور پھر یہ شعر لکھا تھا ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق ☆ ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

یہاں عربی میں بعض ایسے عظیم الشان کام ہوئے ہیں کہ جو بہ ظاہر ایک آدمی کا کام نہیں معلوم ہوتا، میں کبھی کبھی کہتا ہوں کہ قدیم مدرسہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک آدمی وہ کام کرتا ہے جو ایک اکادمی کرتی ہے، ایک آدمی اور اکیڈمی معجم المصنفین کے بیس ہزار صفحات میں چالیس ہزار شخصیتوں کے تذکرے ہیں، ان جلدوں کو تنہا مولانا محمود الحسن خاں ٹونکی نے لکھا، صاحب نزہۃ الخواطر نے ۵۳-۵۴ سال کی عمر میں آٹھ جلدوں میں چار ہزار سے زائد شخصیتوں کا تذکرہ ایسا منضبط کر دیا ہے کہ اس سے بہتر اس موضوع پر کوئی اور مرجع نہیں، ایسے ہی ان کی کتاب ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' ہے جس سے ہمارے دوست پروفیسر خلیق احمد نظامی خوب واقف ہیں، یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں سو برس میں جتنا کام ہونا چاہئے تھا، وہ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے نہیں ہوا، پھر بھی اس عرصہ میں یہاں جو کام ہوا اس

کی نظیر عالم اسلام میں نہیں، امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کے بہت سے مقامات سے مجھے بھی اختلاف ہے، طرز فکر سے اختلاف کرنا ہر صاحب علم کا حق ہے، لیکن جس طاقت ور انگریزی زبان اور جس ادیبانہ وساحرانہ زبان میں یہ لکھی گئی، اس کا اعتراف اہل زبان بھی کرتے ہیں کسی اسلامی ملک میں اس سے زیادہ موثر اور طاقت ور زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، اسی طرح ان کی کتاب ''ہسٹری آف سرسینس'' میں جو روانی ہے اور جس فاضلانہ بلکہ مستشرقانہ انداز میں اس کے مواد کو جمع کر دیا گیا ہے، اس کی مثال بھی کم ملے گی، پھر قرآن مجید کے بہترین انگریزی ترجمے بھی اسی سرزمین میں ہوئے، ڈاکٹر عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ پکتھال صاحب کی میننگ آف دی گلوریس قرآن بھی ہندوستان ہی کی رہین منت ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی کا فاضلانہ اور محققانہ ترجمہ بعض حیثیتوں سے بالکل منفرد ہے، پھر بھی حضرات! یہ واقعہ ہے کہ اس سو برس میں جو کام اس سلسلہ میں ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہوسکا، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اگر ہم آج بھی یورپ اور امریکہ جائیں اور ہم سے کہا جائے کہ ہم اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں، تو ہمارے پاس ہندوستانی مصنفین کے سوا کوئی اور کتاب نہیں، علامہ اقبالؒ کی کتاب ''ری کنسٹرکشن آف اسلامک تھاٹ'' کے بعض مقامات سے مولانا سید سلیمان ندویؒ کو اختلاف تھا، لیکن اگر کوئی شخص اسلامی فکر کی بلندی، عمق اور گہرائی سے متاثر ہونا چاہے تو علامہ اقبال کی اس کتاب کو پڑھے، آج بھی اگر کسی شخص کے دل میں سیرت اور صاحب سیرت کی محبت کی طلب ہے تو خطبات مدراس کا مطالعہ کرے، اس کا انگریزی ترجمہ ''دی گلوریس پرافٹ'' کے نام سے ہماری مجلس نشریات و تحقیقات نے شائع کیا ہے، اس کا عربی زبان میں ترجمہ ''الرسالۃ المحمدیہ'' ہمارے فاضل دوست مولانا محمد ناظم ندوی نے کیا ہے، علامہ یوسف القرضاوی منہ بھر کر اس کی تعریف کرتے ہیں، سیرت النبیؐ پر اس سے بہتر اور ایسی مختصر اور جامع کتاب دوسری نہیں، یہ کام اس سو برس میں انجام پایا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے جن لوگوں کے ذہن میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہوا، ان میں علامہ شبلی نعمانیؒ کو اولیت حاصل ہے، ان ہی میں نواب عماد الملک اور چند دوسرے لوگ بھی تھے، سرسید کے خیالات اور ان کی تفسیر کے بعض مقامات سے اختلاف ہے، لیکن وہ پہلے شخص ہیں جن کے دل پر سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' پڑھ کر چوٹ لگی، انہوں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اب زمانہ کس رُخ پر

جارہا ہے اور ہمیں کس قسم کے لٹریچر کی ضرورت ہے اور کس طرح سیرۃ النبی اب لکھی جانی چاہیے، میں علم دین کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اور علمی گروہ کے اہم ترین افراد کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ سرسید پہلے شخص ہیں جن کے دل پر ایک چوٹ لگی اور ان کی مغفرت کے لیے یہ کافی ہے کہ جب وہ سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے لندن گئے اور وہاں سے انہوں نے محسن الملک کو جو خطوط لکھے ان میں یہ بھی ہے کہ میرے ظروف، میرے گھر کے برتن فروخت کر کے مجھے پیسے بھیجے جائیں تاکہ میں کام انجام دے سکوں، ان کے ساتھ ان کے کام کے مددگار مولوی چراغ علی وغیرہ بھی تھے، میں یہ کہنے کے لیے معافی کا خواستگار ہوں کہ ان کا طرز مدافعانہ اور معذرت آمیز ضرور تھا، لیکن ہمیں کسی چیز کو اپنے زمانہ اور ماحول سے الگ کر کے دیکھنا نہیں چاہیے، کسی چیز کو اس کے ماحول سے نکال کر کسی اور ماحول میں پہنچا کر کوئی حکم لگانا بڑی زیادتی ہے، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت کے حالات کیا تھے، زمانہ کا بھی ایک تقاضا ہوتا ہے۔

ہمیں یہ فخر ہے کہ ادب اسلامی پر پہلا سمینار ندوۃ العلماء لکھنؤ کو بلانے کا شرف حاصل ہوا، عربی زبان کا امام مصر ہے، سعودی عرب کی تو وہ زبان ہی ہے اور وہیں سے عراق اور شام وغیرہ پہنچی گئی، اللہ تعالیٰ نے ندوہ کے خادموں کو یہ خیال اور شرف بخشا کہ انہوں نے ادب اسلامی پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد کیا، جو بہت کامیاب رہا اور اس کی صدائے بازگشت ابھی تک سنی جارہی ہے، اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سب سے پہلا سمینار ہندوستان ہی میں ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ ٹھوس اور سب سے قیمتی کام یہیں انجام پایا اور پھر ہندوستان میں ہونا تھا تو اعظم گڑھ ہی سب سے موزوں جگہ تھی اور مزار شبلی ہی سے چند گز کے فاصلہ پر اور دارالمصنفین کی دیوار کے سایہ میں ہونا چاہیے تھا، لیکن حضرات! ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ

گمان مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں ☆ ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

علم و تحقیق کا کوئی کام آخر نہیں ہوتا ہے، علم میں کوئی چیز آخر نہیں کہی جاسکتی، علامہ شبلی کی خدمات آج بھی دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں، ان کی سیرۃ النبی اور الفاروق آج بھی بے مثال ہیں، الجزیہ فی الاسلام، حقوق الذمیین، کتب خانہ اسکندریہ اور اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر آج بھی اہمیت کی

جاہل ہیں، آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کتب خانہ اسکندریہ پر جب ان کا مضمون شائع ہوا تو کالج کے مسلمان طلبہ کا سر فخر سے اٹھ گیا اور رات دن یہ طعنہ اپنے انگریز استادوں سے سنا کرتے تھے مسلمانوں نے کتب خانہ اسکندریہ کو جلا دیا، اس میں آگ لگا دی، مسلمان طلبہ اب ان کو فخر کے ساتھ جواب دینے لگے، اب ڈاکٹر ہٹی نے بھی اپنی کتاب ''اے شارٹ ہسٹری آف دی عرب'' میں بڑے مدلل طریقے سے اس کا انکار کیا، اب کوئی صاحب علم اس کے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے اس کتب خانہ کو جلایا، لیکن ہم آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ علامہ شبلیؒ کے مضمون سے پہلے مسلمان طلبہ کو کس شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ان کو اٹھتے بیٹھتے یہ طعنہ دیا جاتا تھا کہ مسلمان تو علم دشمن ہیں، علم سوز ہیں، کتاب سوز ہیں، لیکن مولانا شبلیؒ کے مدلل مضمون کے بعد ان طعنہ زنوں کو مسلمان طلبہ خاموش کر دیا کرتے تھے۔

اس سیمینار میں شرکت کے لیے عرب، پاکستان اور تھائی لینڈ سے فضلا آئے ہوئے ہیں، تاکہ وہ یہ شہادت دیں کہ علامہ شبلیؒ نے غلطی نہیں کی، انہوں نے سفر کا رخ غلط طریقہ سے متعین نہیں کیا تھا، انہوں نے کوہ کندن اور کاہ برآوردن پر عمل نہیں کیا، انہوں نے صحیح سمت اور رخ متعین کیا اور جو لوگ کشتیاں جلا کر دنیا اور دنیا کی تمام ترقیوں اور آسائشوں سے آنکھیں بند کر کے اس آستانہ شبلیؒ و سلیمان پر بیٹھے ہیں، وہ غلطی نہیں کر رہے ہیں، وہ عالم اسلام کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں، ان کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔

میں دار المصنفین کے ذمہ داروں کو جن میں خوش قسمتی سے میں بھی شریک ہوں اور خود بھی اس مبارک باد کو بلا کسی تواضع و انکسار کے قبول کرتا ہوں اور اپنے رفقا پورے ضلع اعظم گڑھ، شہر اعظم گڑھ اور ان سب لوگوں کو جن کو علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سے جذباتی و ذہنی تعلق ہے، مبارک باد دیتا ہوں کہ اس سیمینار کے انعقاد سے مدتوں کی تمنا پوری ہوئی، اللہ تعالیٰ اس کو مبارک فرمائے اور اس سے علم کا کارواں آگے بڑھے''۔

یہ ایمان پرور خطبہ ہزاروں کے مجمع میں بڑی متانت اور سنجیدگی سے سنا گیا اور سامعین کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ محض ایک خطبہ نہیں سن رہے ہیں، بلکہ اس سے بہت کچھ حاصل بھی کر رہے ہیں، جس سے ان کے ذہن میں جلا اور قلب میں سکینت پیدا ہو رہی ہے، اس خطبہ کے بعد

مولانا سعید الرحمٰن ندوی ایڈیٹر البعث الاسلامی واستاد عربی دار العلوم ندوۃ العلما نے مہمانوں کا تعارف عربی میں کرایا، اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین نے اس کام کو اردو میں انجام دیا، پھر باری باری یہ معزز مہمان اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار کرنے کے لیے اسٹیج پر مدعو کئے گئے۔

ڈاکٹر محمد محمو طنطاوی : سب سے پہلے ابوظہبی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ شریعت وقانون اسٹیج پر تشریف لائے اور انہوں نے عربی میں مجمع کو مخاطب کیا، بعد میں اس کا اردو ترجمہ مولانا سعید الرحمٰن ندوی نے کیا، انہوں نے فرمایا کہ یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج ہم اپنے بھائیوں سے مل رہے ہیں، جن سے ملنے کی تمنا بہت دنوں سے دلوں میں موجود تھی، مجھے آپ سے مل کر بہت زیادہ خوشی ہورہی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اور ہم کو ہمیشہ ملاتا رہے، اس مبارک مجلس میں متحدہ عرب امارات یونیورسٹی، اس کے ریکٹر اور اساتذہ کی طرف سے آپ حضرات کو ان کا سلام پیش کررہا ہوں، ان کی نمائندگی کی عزت حاصل کرکے ان کے بہترین جذبات بھی آپ کے لیے ساتھ لایا ہوں، میں اس سمینار کے ذمہ داروں کا بھی بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیں یہاں آنے کا موقع فراہم کیا، اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جس نیک مقصد کے لیے یہ اجتماع ہورہا ہے، اس میں پوری کامیابی ہو، اس کا ایک بہت اہم مقصد ہے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے جو کچھ ابھی فرمایا اس میں ہمارے لیے بہت بڑی رہنمائی ہے، ان کی باتوں کی روشنی میں ہم چل کر بہت کچھ اس سمینار سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جن سے ہمارا صحیح مقصد حاصل ہو، امید ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کے تعاون سے آگے بڑھیں گے اور اپنے اصلی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

جناب حکیم محمد سعید : اس کے بعد جناب حکیم محمد سعید ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی اسٹیج پر اپنی مخصوص سفید شروانی میں آئے تو حاضرین کی نظریں ان کی وجیہ اور شکیل شخصیت پر چپکی ہوئی تھیں، انہوں نے فرمایا:

جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ومعزز حاضرین! میرا یہ بڑا خوش گوار فرض ہے کہ میں منتظمۂ موتمر کا شکریہ صمیم قلب سے ادا کروں، کہ انہوں نے از راہِ لطف وکرم مجھے اس عظیم اجتماع میں شرکت کی دعوت دی اور پھر آپ کی خدمت میں یہ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس کا موقع بھی عطا فرمایا کہ میں اس موتمر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار

ارباب دانش کے سامنے کروں، مجھ کو سب سے پہلے یہ اعتراف کرنا ہے کہ ہم اس خطۂ زمین پر جمع ہیں، جہاں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم لکھی گئی اور اس کی برکت یہاں اور اس وقت سایہ فگن ہے، آپ سب واقف ہیں کہ دارالمصنفین کے عظیم ادارہ کا آغاز اسی ارادہ سے ہوا تھا کہ سیرۃ النبیؐ لکھ کر اس کی تکمیل کی جائے، تاکہ اس کے مطالعہ سے لوگ مستفید ہوتے رہیں، اس موتمر کا عنوان ''الاسلام والمستشرقون'' کئی اعتبار سے ہمارے لیے قابل توجہ ہے، اس موضوع پر ہمارے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈال دی ہے اور علامہ شبلی نعمانیؒ اور حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے جو اقتباسات ناظم دارالمصنفین نے پیش کیے ہیں وہ اور بھی باعث فکر وتوجہ ہیں، مجھے یقین ہے کہ جس شان دار انداز سے اس موتمر کا انتظام کیا گیا ہے، اس کے نتائج انشاء اللہ تعالیٰ دوررس ہوں گے اور ہم مستشرقین کے خیالات کی اصلاح اور تردید کرسکیں گے، علوم وفنون کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی علم دائرۂ اسلام سے خارج نہیں، لیکن ہم نے جس انداز سے علوم وفنون سے تغافل برتا ہے، اس پر بہت احتیاط سے ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے، اگر یہ موتمر ہمارے اور عالم اسلام کے لیے کوئی لائحہ عمل بنا سکے جس سے ہم اپنے مسائل سے عہدہ برآ ہوسکیں، تو یقیناً یہ ایک عظیم کام یابی ہوگی، میں اپنے لیے یہ خوش گوار فرض سمجھتا ہوں کہ آخر میں اپنی، اپنے ادارہ اور پاکستان کی طرف سے اس موتمر کے منتظمین کو مبارک باد دوں کہ انہوں نے یقیناً یہ ایک نہایت نیک قدم اٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں میں برکت عطا فرمائے۔

مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی: مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی اس وقت اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد میں پروفیسر، موتمر عالم اسلامی کے آنریری ڈائرکٹر جنرل اور بین الاقوامی المجمع العلمی لرابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کے رکن ہیں، وہ اسٹیج پر آئے تو اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے ناظم دارالمصنفین کی دعوت ملی کہ میں اس اجتماع میں شرکت کروں تو شکر گزاری سے زیادہ اپنے اوپر ایک بوجھ محسوس ہوا، اتفاق سے انہی دنوں مجھے ایک ڈگری لینے کے لیے بنکاک جانا تھا، اس کے بعد مکہ مکرمہ گیا، وہاں سے آیا تو صرف تین گھنٹے اسلام آباد میں ٹھہر کر یہاں آگیا اور محض اس شوق میں آیا کہ دارالمصنفین ہی پہلا ادارہ ہے جو مستشرقین کے زہر کا تریاق پیش کرتا رہا ہے، اسلام پر مستشرقین نے

جو کام کیا ہے، اس کی بنا جھوٹ پر ہے، وہ بار بار جھوٹ بول کر اس کو سچ کا درجہ دے دیتے ہیں، مشہور مثل ہے کہ جھوٹ چوبیس گھنٹے آگے نکل جاتا ہے، سچ دوڑتا ہی رہتا ہے، لیکن پیچھا کر نہیں پاتا، انہوں نے اچھے کام ضرور کیئے ہیں، کتابیں چھاپی ہیں، ان کا انڈیکس بھی بنایا ہے، لیکن انہوں نے یہ کام دل سے نہیں کیا، ان سے کہا گیا، اس کی اجرت پائی، اس لیے یہ کام کرتے رہے، لیکن جب کبھی اپنے دل سے کوئی بات کہی یا لکھی تو کہیں ڈنک مار دینے کا موقع نہیں چھوڑا، ہم اس کو بہت غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر پہلا سمینار آپ کے دارالمصنفین میں ہورہا ہے، دارالمصنفین آپ کے لیے باعث فخر ہے، ہمارے لیے باعث فخر ہے اور سب کے لیے باعث فخر ہے کہ وہ کسی تعصب کے بغیر علمی کام کر رہا ہے اور یہ ہر قسم کی معاونت کا سو فی صدی مستحق ہے، ہمارے لیے یہ مسئلہ اہم رہا ہے کہ مستشرقین جو زہر پھیلا رہے ہیں اس کے علاج کی کیا ترکیب کی جائے، اللہ کرے کہ ہم ایک پروگرام بنا کر اس کے لیے کچھ کر سکیں اور اس کی جگہ دارالمصنفین ہی ہوسکتی ہے اور قطعی طور پر ہوسکتی ہے، یہ کام یہیں سے شروع ہو، اسی شوق کی بنا پر میں یہاں کھنچ کر آ گیا ہوں، یہ واقعہ ہے کہ اگر یہاں یہ کام نہیں ہوا تو کہیں نہیں ہوگا، اس وقت اتنے اہل فضل و کمال جمع ہو گئے ہیں ان سب کو یاد رکھنا چاہئے کہ جب عیسائیوں سے خلافت راشدہ کے زمانہ کی فوجوں نے شام، عراق اور مصر کی سرزمین حاصل کی تو ان کا غصہ کبھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور انتقامی جذبات کبھی مردہ نہیں ہوئے، یہ تلوار کے ذریعہ سے صلیبی جنگ کی شکل میں ابھرے اور ان کا قلم تو برابر چلتا رہا، ان کے اولین مستشرق کو تو اللہ نے ہدایت دے دی کہ وہ مسلمان ہو گیا اس کے بعد سے جتنا کام ہوا تو ان کا رخ بدلا ہوا ہے، اسلام کا مقابلہ آج کمیونزم سے ہے، اس کا لب ولہجہ بھی بدلا ہوا ہے، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ان کا لائحہ عمل بدل گیا ہے، وہ اپنے قلم سے آپ سے اسی طرح لڑ رہے ہیں، گیارہویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی کے مستشرق سب کے سب عیسائی اوقاف سے تنخواہ پا کر خاص مقصد کو سامنے رکھ کر کام کرتے رہے اور اگر وہاں سے ہٹ جاتے تو چپراسی کی تنخواہ بھی شاید نہ پاتے، مگر ان تنخواہ دار مستشرقین نے جو زہر پھیلایا ہے، اس کا علاج اگر آپ اجتماعی طور پر نہ کریں گے تو ہمارے نوجوانوں پر زہریلے اثرات ضرور مرتب ہوتے رہیں گے، یہ وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے کہ ہم دنیا کو سمجھائیں کہ اسلام وہ نہیں ہے جو مستشرقین پیش کرتے ہیں، اسلام وہ ہے جو تھا

اور واقعی ہے، مستشرقین کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان میں گہری لیاقت نہیں ہوتی، میرا تجربہ ہے کہ عیسائی مشنریوں میں کسی کا ایمان عیسائیت پر نہیں ہے، صرف ان کو اپنی تنخواہ پر ایمان ہے، لیکن ان کا ایمان جو کچھ بھی ہو وہ جو زہر پھیلا رہے ہیں، اس کا تریاق ہم کو برابر پیش کرتے رہنا چاہئے، ہم آپ کے لیے دعا کرتے ہیں، اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حقاً وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ باطلاً وَارْزُقْنَا اِجْتِنَابَه۔

مفتی سیاح الدین کاکاخیل پاکستان : مفتی صاحب پاکستان کے اسلامی نظریاتی کونسل کے اہم رکن ہیں، وہ اسٹیج پر مدعو کئے گئے تو اپنی جان دار آواز میں فرمایا کہ دارالمصنفین سے میرا تعارف میرے بچپن کے زمانہ سے ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ فضل وکرم ہے کہ ابتدا ہی سے میرا تعلق اہل علم سے رہا، اسی بنا پر بچپن سے اب تک اس ادارہ کا معتقد رہا ہوں، اسی کی علمی خدمات کی قدر کرتا ہوں اور اس کی کتابیں پڑھنے کے بعد اس کے لیے دعائیں بھی کرتا ہوں، مستشرقین کیا کچھ کررہے ہیں، اس کا علم ہے، لیبان کی کتاب تمدن عرب کی بڑی شہرت ہے، لاہور میں یہ کتاب تیسری بار شائع ہوچکی ہے، مگر اس میں جو حصہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے، اس کو پڑھ کر دوبارہ نہ پڑھ سکا، اس نے جو کچھ لکھا وہ تو اپنی فطرت کی بنیاد پر لکھا، لیکن مجھ کو اس پر حیرت ہوئی کہ اس کے مترجم نے جا بہ جا بڑے بڑے حواشی لکھے ہیں، مگر جو حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک میں ہے، اس پر کچھ نہیں لکھا ہے، اس اجتماع میں قرارداد یہ بھی ہو کہ یہ کتاب جب کوئی مسلمان ناشر شائع کرے تو اس میں اس حصہ کی پرزور تردید لکھی جائے، میرا تعلق اس وقت ایک قانونی ادارہ سے ہے، اسلامی قوانین کے سلسلہ میں مستشرقین نے بہت ہی لغویت سے کام لیا ہے، انہوں نے ان کو اس طرح غلط شکل میں پیش کیا ہے جس سے لوگوں کے دلوں میں نفرت اور وحشت پیدا ہو اور ان کو وہ غیر مہذب قسم کے قوانین سمجھیں، اس سلسلہ میں کچھ کام کرنا ہمارے ذہن میں تھا، لیکن الحمد للہ دارالمصنفین کی یہ تحریک اس اجتماع اور اس محفل سے میرے دل میں اس کی ضرورت کا اور احساس بڑھ گیا، اب میں اپنے ادارہ کی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ ان مستشرقین کے گم راہ کن خیالات و بیانات کا پورا مداوا ہو، میں یہاں آکر انتہائی خوش ہوں، یہاں جو لمحات گزر رہے ہیں، ان کو اپنی زندگی کے سب سے زیادہ قیمتی لمحات سمجھ رہا ہوں،

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اور اپنے مقاصد میں کامیاب کرے، اس ادارہ، ندوۃ العلما، دارالعلوم دیوبند اور اس مملکت کے دوسرے دینی اداروں کو اسی طرح دین کی خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے لیے موانع دور ہوتے رہیں۔

ڈاکٹر سید سلمان ندوی : استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کے صاحب زادے ڈاکٹر سید سلمان ندوی اس وقت جنوبی افریقہ کی ڈربن یونیورسٹی میں ثقافت اسلامیہ کے صدر ہیں، وہ اسٹیج پر بلائے گئے تو بہت ہی جذباتی انداز میں بولے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں سے شروع کروں، تقریباً پچیس برس کے بعد یہاں حاضر ہوا ہوں، میں اپنے ساتھ یادوں کی بارات لایا ہوں، جس میں شہنائیاں بھی ہیں اور ہاں کچھ نوحے بھی، میں یہیں پیدا ہوا، میرا بچپن یہیں گزرا، میری تعلیم و تربیت کی داغ بیل اسی جگہ ڈالی گئی، ۱۹۵۳ء میں والد مرحوم آخری بار ہندوستان آئے تھے، تو ندوۃ العلما کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے انہوں نے ایک شعر پڑھا تھا، وہی میرے جذبات کی ترجمانی کرسکتا ہے ؂

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو ☆ میں اپنے آپ مانند مہماں لے کر آیا ہوں

یہ شعر پڑھتے وقت ان پر رقت طاری ہوگئی، کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے کہ دارالمصنفین کی تاسیس کا سب سے بڑا سبب مستشرقین کے حملہ کا دفاع تھا، سیرت نبویؐ کی تدوین کا آغاز اسی کام کے لیے ہوا، دارالمصنفین کو اس کا حق تھا کہ اس اجتماع کا انعقاد کرے، اگر مجھے معاف کیا جائے تو شاید میں یہ کہوں کہ آج سے بہت پہلے ہونا تھا، لیکن ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے، بحمد اللہ بنیاد پڑ گئی، اب کارواں کے آگے بڑھنے کا موقع ہے، والد مرحوم نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کو جو خطوط لکھے تھے، اس میں انہوں نے اپنے حالات و کوائف لکھے تھے، اس کا ایک پیرگراف یہ تھا کہ میں پچھلے پچیس تیس سال سے یورپ اور مستشرقین کے حملوں کا جواب دے رہا ہوں اور اس کا دفاع کر رہا ہوں، حضرت مولانا تھانویؒ نے اس پر تحریر فرمایا تھا کہ جو کام آپ کر رہے ہیں وہ آپ ہی کے قلم سے ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے، کہنا یہ ہے کہ جس مجلس اور جس جگہ یہ کام ہوا تھا اور جہاں یہ اجتماع آج ہو رہا ہے، اس کے بعد امید ہے کہ انشاء اللہ کوشش اور تیز ہوگی، میری چند تجاویز ہیں، وہ انشاء اللہ مقالہ کی نشست میں پیش کروں گا، اللہ تعالیٰ برکت اور کامیابی عطا فرمائے۔

جناب سید حامد: مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جب اسٹیج پر آئے تو فرمایا کہ یہ مجلس ایک طویل صبر آزما علمی ریاضت کا نقطۂ آغاز ہے، مستشرقین سے ہماری شکایت بجا ہے، لیکن دراصل یہ شکایت ہمیں خود سے ہونی چاہئے، قدرت کا اصول ہے کہ خلا کو گوارا نہیں کرتی، ہم نے علمی تحقیقات کا دامن ہاتھ سے جانے دیا تو گویا اغیار کو دعوت دی کہ آؤ میدان تمہارے ہاتھ ہے، نتیجہ ظاہر ہے، میں آپ کا رہین منت ہوں کہ مجھے اس جلسہ میں شرکت کی دعوت دی، مجھے اس کا احساس ہے کہ ایک فرد کی حیثیت سے یہ کم سواد ہرگز اس کا مستحق نہ تھا کہ علما کے اس جلسہ میں شریک ہو سکے، آپ نے مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نمایندے کی حیثیت سے بلایا ہے، میں یونیورسٹی کی طرف سے آپ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر اور ارمغان تبریک پیش کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ دونوں اداروں کے درمیان جس شرکت کار کی یہ دعوت غماز ہے، انشاءاللہ وہ فروغ پائے گی اور اس کے نتائج معنی خیز ہوں گے، یہ علمی تعاون مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت اور ان کی دینی فلاح کے لیے مدومعاون ثابت ہوگا۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی: پروفیسر خلیق احمد نظامی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور سابق سفیر شام نے اس اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو مبارک باد دیتا ہوں کہ وقت کے ایک اہم تقاضے کو انہوں نے پورا کیا اور سب کی طرف سے یہ فرض ادا ہوگیا، ہر قوم کی تاریخ اور تمدن کی ایک اجتماعی روح ہوتی ہے، مستشرقین نے اسلام پر بہت کچھ کام کیا ہے، لیکن وہ اس کی روح تک نہیں پہنچ سکے ہیں، گو اپنے پرفریب اور معروضی نقطۂ نظر سے اس کی روح کو مجروح کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں، چند غلطیوں کی تصحیح آسان ہے، اگر زہر اس طریقہ سے دیا جائے کہ کام ودھن کو تو تلخی محسوس نہ ہو، لیکن اگر رگ وپے پر اس کے اثرات اتر جائیں تو بہت سخت بات ہے، مستشرقین نے ہماری خودداری اور خود اعتمادی دونوں پر بڑی ضرب لگائی ہے، اس سلسلہ میں سب سے بڑا کام سرسید احمد خانؒ، مولانا شبلیؒ، مولانا محمد علی مونگیریؒ اور علامہ اقبالؒ نے انجام دیا، اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کو یہ بتایا کہ جس علم کو ہم کھو چکے ہیں، اس کو حاصل کرکے پورے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنا چاہئے، انہوں نے بتایا کہ اپنی خودی کو کھونے کے بعد مسلمانوں نے برسوں نطشے اور یورپ کے مستشرقین کی زنار اپنی گردن میں ڈالے رکھی، دارالمصنفین نے یہ بہت بڑا کام شروع کیا ہے،

امید ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی اور رہ بری میں یہ کام پورے طور پر انجام پائے گا، مگر یہ پہلی منزل ہے، اس سے مطمئن نہیں ہونا چاہئے، مستشرقین کے کام بہت عظیم الشان ہیں، اس کے دفاع اور آگے بڑھنے کے لیے بڑے عزم اور ہمت کی ضرورت ہے، مگر امید ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سرکردگی میں یہ عزائم کام یاب ہوں گے۔

ڈاکٹر ابراہیم قریشی: جمعیۃ اسلام بنکاک تھائی لینڈ کے نمایندے جناب ڈاکٹر ابراہیم قریشی اسٹیج پر تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے ہمیں اس مذاکرۂ علمی میں یک جا کیا، میں امید کرتا ہوں کہ اس کے ذریعہ سے دین اسلام کی بہتر سے، بہتر خدمت ہوگی، میں جمعیۃ علمائے تھائی لینڈ کی طرف سے اس موقع پر آپ سب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں، آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ تھائی لینڈ کے عوام مسلم و غیر مسلم دونوں کسی نہ کسی حیثیت سے دارالمصنفین سے تعلق رکھتے ہیں، میں جب بچہ تھا تو میرے والد بزرگ وار نے شبلی اکیڈمی کے بارے میں بتایا تھا، لیکن اس وقت اس کی پوری اہمیت سے واقف نہ ہوسکا، اپنے اسکول کی تعلیم کے زمانہ سے اب تک اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے بارہ میں غیر مسلموں کے حلقہ میں جو مسخ شدہ حالات پیش کئے جارہے ہیں، ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس کی اصلاح درسی کتابوں اور اچھے لٹریچر کے ذریعہ سے کریں، یہ میری خواہش ہے کہ تنقیدی اور تحقیقی انداز میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت لکھوں، ۱۹۷۰ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ رابطۂ اسلامی کا مہمان تھا، جب ہم مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو مواجہ شریف کے سامنے کھڑے ہو کر دعا کی کہ "اے اللہ کے رسول! ہم آپ سے محبت کرتے ہیں اور اخلاص کے ساتھ آپ کی اتباع کرتے ہیں، اے اللہ! مجھے طاقت دے، علم دے اور وسائل دے کہ میں اس مشکل کام کو انجام دوں، آمین" میں بھی رویا، میری اہلیہ بھی روئیں، کچھ سال قبل مولانا شبلیؒ کی سیرۃ النبی کی جلدیں حاصل کیں، مجھے یہ اعتراف ہے کہ اس کی زبان بہت عمدہ ہے اور یہ الفاظ کے ذخائر سے مالا مال ہے، مگر اردو نہ جاننے کی وجہ سے اس سے استفادہ کرنا میرے لیے مشکل ہے، میں کراچی آیا تو سیرۃ النبی جلد اول کا انگریزی ترجمہ جو جامعۃ الفلاح نے شائع کیا ہے اور دوسری جلد سبط احمد نے طبع کرائی ہے، ان کو میں نے حاصل کیا اور جب ان کا مطالعہ کیا تو مجھے خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (مجھے پکارو، میں سننے کے لیے تیار ہوں) اسی کے بعد میں نے اور کتابیں مہیا کیں، خاص کر صحاح ستہ حاصل کی، جہاں مولانا شبلیؒ نے صرف حوالہ دیا، میں نے پوری حدیث نقل کی اور اس کا ترجمہ دیا، اسی مناسبت سے میں نے یہ عرض کیا کہ تھائی لینڈ کا تعلق دارالمصنفین سے ہے، میری کتاب کی پہلی جلد ہجرت کے واقعات تک ہے، یہ تین سال پہلے شائع ہو چکی ہے، دوسری جلد پہلی جلد سے رسول اللہ کے وصال تک ہے، یہ زیر طبع ہے جو انشاء اللہ ۱۹۸۳ء تک شائع ہو جائے گی۔

یہ اسلام کے احیا کا دور ہے، ہم اپنے ایمان کو قوی بنائیں، ایک مسلمان کا ایمان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ہے، ہم الہ کے سارے تصورات کو ختم کر کے اپنے دلوں کو پاک کریں اور ان میں اللہ کا خیال جاگزیں کریں، تب ہی ہمارا ایمان پختہ ہوگا، اگر ہم یہ نہیں کرتے تو ہمارے ایمان میں پختگی پیدا نہیں ہو سکے گی، اس کے بعد ہم اس پر عمل کریں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (احزاب)	تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔

تب ہی محمد ﷺ پر عقیدہ پختہ ہوگا، ہم کو رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر عمل کرتے رہنا چاہئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران)	اور نہ کم زور پڑو اور نہ غم کرو، اگر تم مومن ہو تو تم ہی سر بلند رہو گے۔

ہم نے دارالمصنفین کے ایک کتابچہ میں یہ پڑھا کہ سیرۃ النبی کے ترجمے ترکی اور انگریزی زبانوں میں ہوئے اور عربی میں بھی کیا جا رہا ہے، اب اس میں یہ اضافہ کر دیا جائے کہ اس کے بڑے حصے کا ترجمہ تھائی زبان میں بھی ہو گیا ہے اور ۱۹۷۰ء سے پڑھا جا رہا ہے، شبلی اکیڈمی سے ہم لوگوں کا تعلق اسی بنا پر ہے۔''

ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری: ڈاکٹر ظفر اسحٰق طہران کی پٹرولیم یونیورسٹی کی نمایندگی کرنے کے لیے تشریف لائے تھے، جب وہ اسٹیج پر آئے تو فرمایا: طہران یونیورسٹی کے مدیر کو اس سمینار میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا، مگر وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر شریک نہیں ہو سکے، سب سے پہلے ان کی طرف سے شکریہ کا

اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ہماری یونیورسٹی کو بھی یاد کیا، اس موقع پر مجھ کو بھی دعوت نامہ موصول ہوا، اس کے لیے بھی شکر گزار ہوں، جس جذبہ سے یہ مذاکرہ منعقد ہو رہا ہے، ہم اس کی قدر دل سے کرتے ہیں، دارالمصنفین کے کام اور اس کے مقاصد سے عالم اسلام کے ہر خطہ کے لوگ واقف ہیں، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو اردو اچھی طرح نہیں جانتے ہیں، وہ سب اس کی قدر کرتے ہیں کہ یہ مذاکرہ ہر لحاظ سے کام یاب ہو، ان مختصر الفاظ کے ساتھ میں آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں۔

جناب شوکت سلطان: جناب شوکت سلطان صاحب سابق پرنسپل پوسٹ گریجویٹ شبلی کالج اسٹیج پر بلائے گئے تو انہوں نے فرمایا: مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرا رشتہ علامہ شبلی مرحوم سے ہے گو کہ ان کے پوتی داماد ہونے کی حیثیت سے میرا رشتہ قانونی ہے، مگر میری اہلیہ اور اولاد کو زیادہ فخر ہے کہ ان کا رشتہ علامہ سے خونی ہے، میں سرزمین شبلیؒ پر معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتا ہوں، خوش آمدید کہتا ہوں، اہلاً و سہلاً، میں مولانا شبلیؒ کے قائم کردہ شبلی کالج میں تیس برس تک فرائض ادا کرنے کے بعد ریٹائر ہوا ہوں اور اب ان کے دوسرے قائم کردہ ادارے شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ اور عاملہ میں ہوں، یہ تعارف میرے خیال میں کافی ہے، اس تیس سال میں اللہ تعالیٰ نے مجھ سے بہت سے کام کرائے ہیں، جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے، علامہ شبلیؒ مرحوم کے الفاظ ہیں "اپنا آلھا خود کیا گاؤں"۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی: سب سے آخر میں صدر جلسہ جناب ڈاکٹر یوسف قرضاوی ڈین شریعت فیکلٹی، قطر یونیورسٹی نے تقریر کی، جس کو سنتے وقت محسوس ہوتا تھا کہ وہ عربی زبان کے بڑے اچھے خطیب ہیں اور اپنے ماہرانہ، باوقار اور سنجیدہ انداز بیان میں جو کچھ فرما رہے ہیں اس پر ان کو پورا اعتبار اور اعتماد ہے، انہوں نے فرمایا کہ یہاں پر دو رابطے جمع ہو گئے ہیں، ایک تو عقیدۂ اسلام کا ہے اور وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے، دوسرا علم کا ہے، جو قوی بن کر رشتوں کو جوڑتا ہے، ہم نے علم ہی کے ذریعہ سے ہندوستان کے علما سے واقفیت حاصل کی، ہم ان کی خدمات کے مرہون منت ہیں، ہم میں کون ہے جو حکیم الامت شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم سے واقف نہیں ہے؟ کون ہے جس نے حجۃ اللہ البالغہ سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے؟ کون ہے جو کشاف اصطلاحات الفنون سے مستفید نہیں ہوا؟ کون ہے جو کنزل العمال سے واقف نہیں ہے؟ کون ہے جو نواب صدیق حسن خاں سے واقف نہیں ہے اور ان کی کتابوں

کا خوشہ چیں نہیں ہے؟ ہم عرب بہ بانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا ہے، کون ہے جو مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو نہیں جانتا؟ کون ہے جو حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا رتبہ شناس نہیں؟ ان کو دیکھنے سے پہلے ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین سے واقف ہوا، یہ علمائے ہند کے کارنامے ہیں۔

عصر حاضر میں سب سے بڑی چیز جو مسلمانوں پر مسلط کی گئی ہے وہ استعماریت ہے، استعماری طاقتیں اپنے ساتھ اپنے افکار و خیالات لائیں جو فوج کشی اور قبضہ سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئیں، فوجیں تو وقتی طور پر آتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں، لیکن ان کے ساتھ جو افکار و خیالات اور عقائد آتے ہیں، ان کے نفع اور ضرر کے اثرات لوگوں کے کردار پر پڑتے ہیں، ہم اس کو فکری یلغار کہتے ہیں، جس میں سب سے زیادہ خطرناک استشراقی تحقیقات ہیں، علمائے اسلام کو بنیادی طور پر مبشرین اور مستشرقین دونوں کا خطرہ لاحق ہے، عیسائی مبلغین اپنی وضع قطع اور لباس سے پہچان لیے جاتے ہیں، مسلمان ان سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں، جس مسلمان کے اندر تھوڑی بہت اسلامی حمیت و غیرت ہوتی ہے وہ ان کے جال میں نہیں پھنستا، لیکن مستشرقین کے فریب سے بچنا مشکل ہے، وہ علم کا لباس پہن کر اور تحقیق کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں تو اچھے خاصے پڑھے لکھے اور سمجھ دار مسلمان بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں اور ان کی کاوشوں اور تحقیقوں کی داد دینے لگتے ہیں، پھر انہی کو مرجع بھی تسلیم کرتے ہیں، یہ مستشرقین اسلام کے خلاف نئے نئے انکشافات کرتے ہیں، جن میں افترا پردازیوں سے بھی کام لیتے ہیں، انہوں نے جمع و ترتیب، تبویب اور فہرست کی تیاری میں مفید کام ضرور انجام دیئے ہیں، کتب خانوں میں پڑے ہوئے مخطوطات کو علمائے اسلام سے روشناس کرایا، ان ہی میں طبقات ابن سعد ہے، المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف اور مفتاح کنوز السنہ جیسی کتابوں سے ان کی عرق ریزی کی نشان دہی ہوتی ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی کتابوں کا تعلق روح سے نہیں ہے، عقائد سے بھی نہیں ہے، سیرت و تاریخ سے بھی نہیں ہے، بلکہ اس کے ہی اشکال سے ہے کیوں کہ جب عقائد یا اسلامی تاریخ یا روح اسلام کا مسئلہ آتا ہے تو پھر ان کے خفیہ عزائم ظاہر ہو جاتے ہیں، ان کا قلم اسلام کے خلاف زہر اگلنے سے رکتا نہیں ہے، انہوں نے اسلام کو تسلیم نہیں کیا، ان کو غزوۂ موتہ،

اجنادین اور صلیبی جنگوں میں جو شکستیں ہوئیں ان کو وہ بھولے نہیں اور اس کا بدلہ قلم سے لے رہے ہیں، جس میں وہ بعض اوقات بڑی بھونڈی غلطیاں کر جاتے ہیں، جس وقت میں اپنی کتاب فقہ الزکوٰۃ لکھ رہا تھا، تو گولڈزیہر کا وہ مضمون پڑھا جو چھ صفحات پر مشتمل تھا، اس میں بہت سی غلطیاں نظر آئیں، وہ بہت سی ایسی باتیں لکھ گیا ہے، جن کا کوئی مرجع، مصدر یا حوالہ نہیں، ایسے مستشرقین کی تحقیقات سے عالم اسلام کے بہت سے محققین متاثر ہوئے، ان ہی میں طٰہٰ حسین کا نام لیا جاسکتا ہے، جنھوں نے الشعر الجاہلی میں گولڈزیہر اور دوسرے مستشرقین کے افکار وخیالات کو صحیح سمجھتے ہوئے جمع کر دیا ہے اور اسے عالم اسلام میں پھیلایا بھی ہے اور نہ جانے کتنے نوجوان اس سے متاثر ہوئے، علمائے ازہر بھی ایسے اثرات قبول کئے بغیر نہ رہ سکے، ان کی کتابوں کو مرجع قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں احمد امین کا نام لیا جاسکتا ہے، مستشرقین کو اسلام میں اگر کوئی مستحسن چیز اور خوبی نظر آتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو یونانی اور رومی قانون سے ماخوذ ہے، انہیں قرآن اور سنت نبویؐ میں بھی کوئی خوبی نظر نہیں آتی اور اگر آتی ہے تو اسے یہودیت اور نصرانیت سے مستعار بتاتے ہیں، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم نے "السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي" میں گولڈزیہر کی ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا ہے جو اس نے امام زہریؒ کے سلسلہ میں کی ہیں، ان استشراقی کوششوں کو ہندوستانی علما نے خوب سمجھا ہے اور ان کے جوابات بھی دیے ہیں، جس طرح مصر میں مفتی محمد عبدہ نے "الاسلام والنصرانية في العلم والمدنية" میں اور ان کے بعد ان کے خلیفہ علامہ رشید رضا مصری نے اپنے مجلّہ ''المنار'' میں پینتیس سال تک ان مستشرقین کی افترا پردازیوں کے جوابات دیئے، اسی طرح ہندوستان میں دارالمصنفین اور ندوۃ العلما نے اس قسم کی کتابوں کا جائزہ لیا اور جوابات لکھے، اگرچہ ان کی بہت سی کتابیں عربی میں منتقل نہیں ہوسکی ہیں، علامہ شبلیؒ اس دستہ کے روح رواں ہیں، مگر ان کا کارنامہ عربی میں منتقل نہیں ہوسکا، ان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صرف ایک کتاب کا ترجمہ عربی میں ہوا، ان کی "الرسالة المحمدية" سے ہم نے ان کو پہچانا، ان محققین کی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا جائے ہم اس میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں، ہم اسلام کو صاف، شفاف اور منقح شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔''(۱)

---

(۱) ان تقریروں کا متن تعمیر حیات لکھنؤ کی اس روداد کی مدد سے بھی تیار کیا گیا ہے، جو اس میں برابر شائع ہو رہی ہیں۔

یہ کھلا اجلاس جب اپنے پورے وقار کے ساتھ ختم ہوا تو تمام سامعین کے چہرے یہ کہہ رہے تھے کہ جو چیز وہ بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں کر سکتے تھے، وہ ان کو اس پنڈال میں اچھی طرح حاصل ہوگئی، وہ بہت کچھ سیکھ کر اٹھ رہے ہیں، ہر شخص کی زبان پر تھا کہ اس کھلے اجلاس کی جان دار فضا سمینار کی آیندہ کارروائیوں کی کام یابی کی ضامن ہے، ہر شخص میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوگیا اور چھوٹے بڑے کام کو انجام دینے میں پیش پیش ہوگیا، جناب محمد مسعود خاں صاحب سابق وزیر اتر پردیش اپنی متانت اور خاموشی کے ساتھ ہر جگہ پہنچ کر کسی نہ کسی کام میں مفید مشورے دے رہے تھے، وزارت میں رہنے کی وجہ سے ان میں بڑی سوجھ بوجھ پیدا ہوگئی ہے، میں ان کا شکر گزار اس لحاظ سے بھی ہوں کہ میری بعض پریشانیوں میں انہوں نے مفید مشورے دیے اور ضرورت کے وقت ٹیلیفون پر دیر تک بیٹھنے کی زحمت گوارا کی، شبلی منزل میں برابر تشریف لا کر یہاں کے کارکنوں کے حوصلے بڑھاتے رہے، کھلے اجلاس کے بعد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے ناظم جناب ابوالحسن علی فراہی اور جناب احمد محمود نائب ناظم اور جناب عبدالرحمٰن ناصر معتمد مال کو بھی دیکھا کہ وہ اس کی کارروائیوں سے پوری دل چسپی لے رہے ہیں، اس مدرسہ کا تعلق دارالمصنفین سے بڑا گہرا ہے، اس بنا پر ان کی یہ دل چسپی بالکل فطری اور حق بہ جانب تھی، کھلے اجلاس کے بعد وہاں سے مولانا عبدالمجید ندوی صدر مدرس دیگر اساتذہ اور کچھ طلبہ بھی آ گئے تھے، مدرسۃ الفلاح بلریا گنج کے صدر مدرس مولانا عبدالحسیب اصلاحی اور وہاں کے استاد مولانا نظام الدین اصلاحی اور مولانا داؤد اکبر اصلاحی نے وہی سارے حقوق ادا کیے، جس کی توقع ان سے تھی، یہ سب حضرات اس تقریب کو اپنی تقریب سمجھتے رہے اور کھلے اجلاس سے متاثر ہو کر سمینار کی کام یابی پر قبل از وقت مبارک باد دے رہے تھے، مئو کے جامعہ اثریہ دارالحدیث کے شیخ الحدیث مولانا فیض الرحمٰن، شیخ الجامعہ مولانا محمد احمد اثری، ناظم جامعہ مولانا فخر العبید اور استاذ مولانا عبداللطیف بھی انتظامی امور سے دل چسپی لے رہے تھے اور مبارک پور کے مدرسہ احیاء العلوم کے ناظم مولانا عبدالباری قاسمی، شاہ گنج کے مدرسہ بدرالاسلام کے مولانا محمد عثمان بھی اس تقریب کی کام یابی پر خوش تھے، مئو کے کاغذ محل کے ماسٹر محمد حسن بھی ہر کام میں پیش پیش تھے اور حیرت اس بات کی ہوئی کہ جناب حکیم محمد مختار اصلاحی نے ممبئی سے اس تقریب میں شرکت کے لیے ایک لمبے سفر کی زحمت گوارا کی، اس کے لیے ہم سب ان

کے بھی شکر گزار ہیں، کھانے کے بعد ظہر کی نماز کے لیے شبلی منزل کی مسجد میں لوگ جمع ہوئے جو اس موقع کے لحاظ سے ہر طرح سجائی گئی تھی، آج سے پچاس سال پہلے نواب مزمل اللہ خاں مرحوم نے اس کے لیے قیمتی دریوں کی جانمازیں اور پردے عطا کیے تھے، جو بڑی حفاظت سے رکھے جاتے ہیں، اس موقع پر ان سے مسجد کو آراستہ کیا گیا تھا، لیکن خاص بات یہ ہے کہ اس موقع کے لیے بمبئی سے سیٹھ عبدالغنی اطلس والے نے بڑی خوب صورت اور دیدہ زیب چٹائیاں بھیجی تھیں جو صحن میں بچھائی گئی تھیں، ان سے مسجد کی رونق دوبالا ہو رہی تھیں، اس کے لیے ہم دل سے شکر گزار ہیں۔

اس مجمع میں مولانا وصی اللہؒ کے خلیفہ اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن مولانا عبدالحلیم صاحب کو دیکھ کر بھی خوشی ہوئی، اس سمینار میں علامہ اقبالؒ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال کی شرکت نہ ہو سکی، حالانکہ آخر وقت تک یہ امید تھی کہ وہ اپنی تشریف آوری سے ہم لوگوں کو ضرور نوازیں گے، اگر وہ آجاتے تو یہاں کے لوگوں کو ان کے دیدار کے اشتیاق کی تشنگی بڑی حد تک فرو ہو جاتی اور سمینار میں مزید رونق ہو جاتی، انہوں نے اپنے آخری خط میں تحریر فرمایا کہ حکومت پاکستان کی منشا کے بغیر میرا کسی بھی غیر ملکی بین الاقوامی کانفرس میں شریک ہونا ممکن نہیں ہوتا، یہ رول ججوں کے لیے خاص طور پر ہے، اعظم گڑھ حاضر ہو کر آپ سے ملاقات نہ ہو سکنے کے لیے معذرت خواہ ہوں، خدا نے چاہا تو کوئی اور موقع فراہم کر دے گا۔''

اس سمینار کے کھلے اجلاس کے بعد رات کو شبلی کالج کے وسیع ہال میں مقالات خوانی کی نشست شروع ہوئی، یہ ہال جناب محمود الازہار ندوی کی خوش سلیقگی اور انتھک محنت کی وجہ سے بڑی اچھی طرح سجایا گیا تھا، اس کی زیبائش اور آرائش میں ان کی مدد ندوۃ العلما کے طلبہ نے ہر طرح کی، جو چھوٹے بڑے، ادنیٰ اور اعلیٰ کام کرنے میں اپنی پوری مستعدی کا ثبوت دے رہے تھے، مندوبین ایک بڑے مثلث کی شکل میں بٹھائے گئے تھے، سامعین کے لیے ہر طرف کرسیاں بچھا دی گئی تھیں، شائقین کے ہجوم سے پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، لاؤڈ اسپیکر کا انتظام اچھا تھا، اس لیے لوگ باہر بھی کھڑے اور بیٹھے نظر آرہے تھے، مقالات کافی تعداد میں آگئے تھے، اس لیے کھلے اجلاس کے بعد ایک کمیٹی بنادی گئی تھی کہ مختلف نشستوں میں صدارت اور مقالہ خوانی کی ترتیب دیتی رہے، اس کے اراکین یہ تھے۔

''ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق، ڈائرکٹر جنرل رابطۂ اسلامی مکہ مکرمہ (۲) ڈاکٹر محمود محمد طنطاوی، صدر شعبۂ شریعت وقانون العین یونیورسٹی متحدہ عرب امارات (۳) ڈاکٹر سید سلمان ندوی صدر ثقافت اسلامیہ ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ (۴) ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری، پروفیسر تاریخ اسلامی پٹرولیم یونیورسٹی طہران (۵) جناب محمد رابع الحسنی ندوی، صدر شعبۂ عربی دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ (۶) مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی الندوی استاذ ادب عربی دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ (۷) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ نئی دہلی، ڈاکٹر مشیر الحق ندوی صدر شعبۂ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

پہلی نشست کی صدارت جناب ڈاکٹر یوسف القرضاوی ڈین شریعت فیکلٹی قطر یونیورسٹی قطر نے کی، جن سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے پہلو میں بیٹھنے کی درخواست کی گئی، ان کے بائیں جانب ڈاکٹر سید سلمان ندوی بیٹھے، جو کاروائی کو آگے بڑھانے کے فرائض کو انجام دینے کے لیے بلائے گئے، وہ استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے صاحب زادے ہیں، ان کو دیکھنے کے لیے لوگ مشتاق رہے، ماشاء اللہ اپنے والد بزرگ وار ہی کی طرح شکیل اور وجیہ نظر آرہے تھے، عربی، انگریزی اور اردو بڑی روانی اور متانت کے ساتھ بولتے ہیں، جس سے حاضرین متاثر ہوئے، سب سے پہلے ڈاکٹر محمود محمد طنطاوی صدر شعبۂ شریعت وقانون العین یونیورسٹی متحدہ عرب امارات اپنا مقالہ پیش کرنے کے لیے بلائے گئے۔

ڈاکٹر محمود محمد طنطاوی : ان کے مقالہ کا عنوان "الاسلام انتشر بالسلم لا بالسیف" تھا وہ زیادہ تر زبانی بڑی رواں اور سلیس عربی میں بولتے رہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

مستشرقین کہتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا، حالانکہ اس کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ایک فرد واحد نے اس کی تبلیغ شروع کی، جب غار حرا میں وحی نازل ہوئی تو سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ بنت خویلد، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ نے اسلام قبول کیا، ایک مدت تک رسول اکرم ﷺ خفیہ طور پر دعوت دیتے رہے، لوگوں نے اپنی خواہش سے دائرۂ اسلام میں داخل ہونا پسند کیا، اسلام آگے بڑھتا گیا اور یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو سزائیں دی جاتی تھیں، نہ کہ اسلام

قبول کرنے والے دوسروں کو سزائیں دیتے، مسلمانوں پر جو ظلم کیا گیا تو حبشہ کی ہجرت کا واقعہ پیش آیا اور پھر مدینہ کی ہجرت ہوئی، جہاں اسلامی مملکت کی بنیاد ڈالی گئی، پھر بھی مسلمانوں کے آلام و مصائب بڑھتے گئے، جس کے بعد یہ حکم نازل ہوا:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاَنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ. (حج:۳۹)	جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے، ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیوں کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا (ان کی مدد کرے گا، وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔

مسلمانوں پر ظلم و تعدی کا سلسلہ جاری تھا، جس پر ظلم کیا جاتا ہے، اس کو حق ہے کہ وہ اپنا دفاع کرے، اسی لیے اس آیت میں ظالموں کے خلاف وسائل کو بہ روئے کار لانے کی اجازت دی گئی، اسلام کی تبلیغ اور کفار سے جنگ کرنے کے سلسلہ میں پہلا حکم تو یہ ہے کہ ان کو صلح و آشتی اور حجت و دلیل سے دعوت دی جائے، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو دوسرا حکم یہ ہے کہ ان سے جزیہ طلب کیا جائے، جس سے یہ مراد ہے کہ وہ اگر اسلامی حکومت کی بالادستی قبول کر لیتے ہیں تو پھر وہ ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہیں اور اگر وہ اس کو بھی قبول نہیں کرتے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ دعوت اسلام میں رکاوٹ پیدا کریں گے، جس کے بعد یہ تیسرا حکم ہے کہ ان سے جنگ کی جائے، ان ممالک کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے جہاں اسلام پھیلا، ان میں ہندوستان بھی ہے، جہاں یہ مسلمانوں کے اخلاق و برتاؤ سے پھیلتا گیا، مدینہ کے اہل کتاب سے رسول اللہ ﷺ نے امن و سلامتی کا معاہدہ کیا، مگر جب ان لوگوں نے اس کی پابندی کرنے کے بہ جائے در پردہ دشمنوں کی مدد کی، حتی کہ رسول اکرم ﷺ کی ذات مبارک کے خلاف ناپاک سازش کرنے لگے تو اس کا سد باب کیا گیا، یہ کھلی ہوئی ہدایت ہے کہ جو چاہے اسلام لائے اور جو چاہے اپنے دین پر برقرار رہے، البتہ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بننے والوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے، اس کو جبراً اسلام قبول کرنے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ	جو لوگ اہل کتاب میں سے اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور

وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صَاغِرُوْنَ. (توبہ: ۲۹)	نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو خدا اور اس کے رسولؐ نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

پروفیسر امیر حسن عابدی : دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے اپنے مقالہ ''پروفیسر ایڈورڈ براؤن اور اسلام'' کے عنوان سے پیش کیا، وہ اپنا پورا مقالہ تو نہ پڑھ سکے، اس کے خاص خاص حصے پڑھ کر سنائے جو یہ ہیں:

فارسی سے پہلے یورپ میں عربی کی ابتداء ہوئی جس کے ذریعہ سے یونانی فلسفہ خاص کر ارسطو کے خیالات سب سے پہلے مغربی یورپ کو معلوم ہوئے تیرہویں صدی میں البرٹس میگنس نے فارابی اور ابن سینا کی کتابوں سے اخذ کر کے ارسطو کی تعلیمات کو پیرس میں پیش کیا، اس صدی میں راجر بیکن اور ریمانڈلل نے مشرقی زبانوں کے حاصل کرنے پر اصرار کیا، جس سے فلسفہ اور سائنس کا مطالعہ ہو سکے، چودہویں صدی کے شروع میں پانچویں پوپ نے یورپ کے مختلف شہروں میں عربی وغیرہ کی پروفیسرشپ قائم کرائی مگر اس کا خیال رکھا گیا کہ اس سے عیسائی مذہب کو کوئی نقصان نہ پہنچے، سولہویں صدی کے شروع میں باقاعدہ یورپ میں مشرقی علوم کا چرچا اور رواج ہوا، دنیا پر مسلمانوں کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے یونانی علوم وفنون کو زندہ رکھا، یورپ والے ان ہی عربی ترجموں سے استفادہ کر کے آگے بڑھے ہیں۔

یورپ میں عربی اور فارسی وغیرہ جیسے مشرقی علوم کی طرف توجہ کرنے کے دو اسباب تھے، ایک تو یہ کہ ان زبانوں، خاص کر عربی کے ذریعہ سے وہ یونانی علوم کو حاصل کر کے سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے فلسفوں کو سمجھ سکیں، دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اسلام، قرآن اور مسلمانوں میں طرح طرح کی خامیاں اور کمزوریاں نکال کر ان پر کیچڑ اچھال سکیں، پھر بھی بہت سے ایسے مستشرقین بھی ہیں جنہوں نے اسلام اور اسلامی علوم وفنون کا مطالعہ بڑی دیانت داری سے کر کے ان سے پورا پورا استفادہ کیا اور مسلمانوں کے دین کے معترف ہوئے، پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کا شمار ایسے ہی مستشرقین میں کیا

[illegible]

ان کے پیغمبر ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے براؤن نے لکھا ہے کہ آپ کا کام بہت مشکل تھا، اس لیے کہ [illegible] عرب [illegible] عملی اور مشغول ہوتے ہیں، انہیں ماوراء الطبیعیات اور الٰہیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، انہیں ایسے خدا کی بھی ضرورت نہیں جو طاقتور تو ضرور ہے، مگر ان سے خدمت اور [illegible] کا خواہاں ہے۔ براؤن کے نزدیک ہجرت (۶۲۲ھ) سے لے کر حضرت عمرؓ کی وفات ([illegible]) تک کا زمانہ مقدس اسلام کا زریں عہد ہے، جو فلسفیانہ اسلام سے جدا اور الگ ہے۔

براؤن نے ڈوزی کا ایک طویل اقتباس دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ بازنطینی اور ایرانی حکومتوں کی [illegible] شکل [illegible] کر لی تھی، لیکن لوگ ان کی مطلق العنانیت کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، [illegible] نے دہشت پھیلا رکھی تھی اور دونوں اپنے مذہبی تعصب کی وجہ سے لوگوں کو ہر

طرح کی اذیتیں دے رہے تھے، کہ یکایک عرب کے ریگستان سے کچھ نئے لوگ نمودار ہوئے، جو پہلے تو بے شمار قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور باہمی جنگ وخوں ریزی میں مبتلا تھے، مگر اب سب ایک ہوگئے تھے، وہ آزاد، لباس وغذا میں سادہ، شریف، مہمان نواز اور سمجھ دار تھے، لیکن اسی کے ساتھ غیور، خوددار، تند مزاج، انتقام پسند، سفاک اور ظالم بھی تھے، دیکھتے دیکھتے بڑی گلی ایرانی سلطنت کا خاتمہ کردیا، قسطنطنیہ کے جانشینوں سے ان کے اچھے صوبے چھین لیے، ٹیوٹن نسل کی حکومت کو اپنے قدموں سے کچل دیا اور بقیہ یورپ میں دھشت پھیلا دی دوسری طرف ان کی فاتح فوجیں ہمالیہ میں داخل ہوگئیں پھر بھی یہ دوسرے فاتحوں کی طرح نہ تھے، اس لیے کہ یہ ایک نئے مذہب کی تبلیغ کررہے تھے، ایرانیوں کی ثنویت اور بگڑی ہوئی عیسویت کے خلاف انہوں نے ایسی توحید کا اعلان کیا جس کو لاکھوں آدمیوں نے قبول کیا اور جو آج بھی انسانی آبادی کے دسویں مذہب کا حصہ ہے، براؤن نے ڈوزی کا یہ اقتباس دے کر اس کا ثبوت دیا ہے کہ وہ اس کے خیالات سے بڑی حد تک متفق تھے، گرچہ ڈوزی کے بعض خیال سے مسلمانوں کا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔

براؤن نے پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی، خلفائے راشدینؓ، حضرت عثمانؓ کی شہادت، حضرت علیؓ کی خلافت اور حضرت امیر معاویہؓ کا اس سے انکار، جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں، خوارج، معاویہؓ کے ساتھ صلح، امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری، یزید، معرکۂ کربلا، ابن زبیرؓ اور مختار کی بغاوتوں، عبدالملک کی حکومت، حجاج کے مظالم، عمر بن عبدالعزیزؒ، ابن عباسؓ کے پروپیگنڈے، بنی امیہ کے زوال کے اسباب، ابومسلم خراسانی، عباسی حکومت، برامکہ، نوروز تہوار کے احیا وغیرہ کا جائزہ تفصیل سے لیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کے ان پہلوؤں پر ان کی نظر اچھی تھی۔

براؤن کے یہاں معتزلہ اور اشاعرہ کی بھی بحث ملے گی، ان کے خیال میں معتزلہ شروع ہی سے یونانی فلسفہ سے متاثر رہے، عباسی خلیفہ متوکل (۸۴۷ھ-۸۶۱ھ) کے زمانہ میں ان کی سیاسی حیثیت ختم ہوچکی تھی، لیکن ان کے دبستان خیال کے تین سو سال بعد بھی زمخشری جیسے مفسر قرآن نے نمائندگی کی، براؤن نے ابوالحسن اشعری اور ان کے بزرگ ابوموسیٰ اشعریؓ کے بے عقل ہونے کی تائید کی ہے، گو اس رائے سے مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقہ کو اتفاق نہیں۔

براؤن نے اخوان الصفا جیسی جماعت کو اہمیت دی ہے، جس کے ذریعہ سے ان کے خیال کے مطابق اسلام اور یونانی فلسفہ میں تطبیق ہوئی، براؤن نے زرتشتیوں کے صاحب کتاب ہونے کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے اور اس کا ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کو مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب جیسا سلوک کرنے میں جھجھک ہو رہی تھی، لیکن عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان سے کہا کہ میں نے پیغمبر ﷺ سے سنا ہے کہ ان کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہئے جو اہل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے، براؤن نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اس لیے ان کے خلاف ایرانی جذبات کارفرما رہے، اس کے برخلاف ایرانیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت امام حسینؓ کی شادی یزدگرد سوم کی لڑکی شہر بانو سے ہوئی، جن سے نو امام عالم وجود میں آئے، اس طرح بقیہ امام حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ساسانی بادشاہوں کی اولاد سے ہوئے، ایران میں حضرت شہر بانو بڑے احترام سے دیکھی جاتی ہیں، ان کے نام سے ایک پہاڑ بھی ہے جس کو کوہ بی بی شہر بانو کہا جاتا ہے اور جو تہران سے ۳-۴ میل جنوب میں ہے۔

براؤن کے نزدیک ایران پر عربوں کی فتح سے زیادہ مشکل کام اسلام کا زرتشتی مذہب پر غلبہ حاصل کرنا تھا، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمان فاتحوں نے لوگوں کے لیے قرآن اور تلوار کے سوا کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں، البتہ انہیں جزیہ دینا پڑتا تھا، کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زرتشتیوں پر کوئی خاص سختی کی گئی یا ایران کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، بیشتر تبدیلی مذہب اختیاری تھی، براؤن کی اس رائے سے ان کی رواداری کا اظہار ہوتا ہے۔

براؤن نے بہت سے مسلمان علما کا ذکر کر کے ان کے تبحر علمی اور دقت نظر کا اعتراف کیا ہے، ان میں سے ایک علامہ شبلی نعمانیؒ بھی ہیں جن کے متعلق وہ لکھتے ہیں: ''جہاں تک میں فیصلہ کر سکتا ہوں، شروع سے لے کر سترہویں صدی کے آخر تک ممتاز فارسی شعرا کا بہترین تبصرہ انتہائی بدقسمتی سے اردو یا ہندوستانی زبان میں لکھی ہوئی شبلی نعمانی جیسے ممتاز عالم کی شعر العجم ہے، براؤن کی اس رائے سے ہم میں یہ احساس ہونا چاہئے کہ ہمارے بزرگوں کے کارنامے بہتر سے بہتر شکل میں دنیا کے مستشرقین کے سامنے پیش کیے جانے کی ضرورت ہے، علامہ شبلیؒ کی منتخب تصنیفات اور تالیفات کو دنیا کی زبانوں میں،

خاص کر انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ دوسری زبان کے لوگ اس سے پورے طور سے استفادہ کرسکیں۔

یہ مقالہ ختم ہوا تو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے پروفیسر امیر حسن عابدی سے یہ سوال کیا کہ براؤن کا خیال ہے کہ اسلام نے ایران کی صرف اوپری سطح کو چھوا تھا اور جو چیز ایرانیوں کے خون میں شامل تھی کبھی ختم نہیں ہوئی، اس کی ایک شکل عجمی تصوف ہے، جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا ''الحذر زین گوسفندان الحذر'' کیا آپ اس رائے سے اتفاق رکھتے ہیں؟ پروفیسر امیر حسن عابدی نے جواب دیا کہ تصوف کی بحث میں اس وقت پڑنا نہیں چاہتا ہوں، کیوں کہ میں فارسی کا طالب علم ہوں اور وہ بھی ادب کا، اسلامیات کا نہیں، اس سیمینار کے لیے میں نے جو مقالہ لکھا ہے اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ فارسی ادب کی تاریخ لکھنے کے لیے اسلام کا مطالعہ ضروری تھا، براؤن نے اسلام کا مطالعہ جس طرح کیا وہی میں نے پیش کیا ہے، میرے مقالہ میں تصوف کا ذکر کہیں نہیں ہے، اس لیے تصوف پر براؤن کے خیالات پر بحث کرنا اس وقت مناسب نہیں ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر خلیق احمد نظامی کا مقالہ ''مستشرقین کے افکار ونظریات کے مختلف دور اور اصلاح حال کی راہ'' کے عنوان سے تھا جو بڑا پُر مغز اس لیے تھا کہ پوری تحقیق اور امعان نظر سے لکھا گیا تھا، اسی کے کچھ حصے حاضرین کو پڑھ کر سنائے گئے، اس میں قابل توجہ وہ حصہ ہے جس میں مستشرقین سے محاذ آرائی کرنے کے بہ جائے ایک راہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

مستشرقین کی تنقید کو محض مقصد بنالینا یا ان کی علمی بددیانتیوں کا نوحہ کرتے رہنا قوائے ذہنی کے اضمحلال کی نشانی ہے، سب سے پہلے ضرورت یہ ہے کہ روح اسلامی پر تحقیق کے نہایت اعلیٰ مرکز قائم کیے جائیں اور دنیا کے ہر گوشہ سے جدید سائنسی تجربوں کو کام میں لاکر اسلامی علوم وفنون کے تمام ماخذ ان مرکزوں میں جمع کردیے جائیں، اس منصوبہ کی کام یابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر ملک پہلے خود اپنے علمی سرمایہ کا جائزہ لے، ماخذ کے سلسلہ میں یورپ کی محتاجی ختم ہونے کے بعد خود اعتمادی کا جو دور شروع ہوگا وہ علمی جدوجہد میں نئی توانائی پیدا کردے گا، یورپ نے اب تک حدیث، فقہ اور جغرافیہ وغیرہ کے

لاتعداد ماخذ شائع کیے ہیں، اب ضرورت ہے کہ مسلمان علما بھی اسی طرح توجہ کریں، وہ اسلامی تاریخ، تہذیب اور تمدن کے متعلق ایسی انسائیکلو پیڈیا تیار کریں جن کی معلومات معتبر اور نقطۂ نگاہ معروضی ہو اور جن سے ان تمام نظریات کی اصلاح ہو سکے جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام یا ڈکشنری آف اسلام کے ذریعہ پھیلائے گئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ایک اجلاس میں کہا تھا: یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات میں اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ قدیم وجدید علوم کے ماہرین ایک جگہ جمع ہوں اور اس کمی کو پورا کریں، پھر ہر عہد ایک نئے علم کلام کا مطالبہ کرتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں جب کہ انسان سَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ اور اس کے منشائے الٰہی کو پورا کرتا نظر آ رہا ہے تو علم کلام سائنس کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اس کی بھی ضرورت ہے کہ قرآن کے مطالعہ کو آگے بڑھایا جائے، حدیث کے مطالعہ کو بھی گولڈ زیہر کے حدود سے آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، وقت کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ فقہ اسلامی کی کتابوں کی تشریح موجودہ دور کی ضروریات کے مطابق ہوتا کہ فقہ اسلامی کے افادی پہلو سامنے آسکیں، آج جب کہ یورپ وامریکہ میں اسلام سے بہ حیثیت دین غیر معمولی دل چسپی لی جارہی ہے، اس کام کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے، اس طرح نہ صرف شاخت وغیرہ کے نظریات کی اصلاح ہو جائے گی بلکہ اسلام کے نظام حیات کے متعلق سوچنے کے نئے پہلو بھی آشکارا ہو جائیں گے، ڈاکٹر اقبالؒ کی دور بین نگاہ نے اس کام کی اہمیت کا اندازہ آج سے پینسٹھ سال پہلے لگایا تھا اور مولانا انور شاہ کشمیری کے ذریعہ سے فقہ اسلامی کو عصر حاضر کے مذاق کے مطابق پیش کرنا چاہتے تھے، اس کام کو اب اور زیادہ ملتوی نہیں کیا جا سکتا، اس ساری جدوجہد میں آب ورنگ اس وقت پیدا ہو گا جب علمی جذبہ سے سرشار، مسلمان علما وفضلا علم کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھ کر اس کام کی طرف متوجہ ہوں گے اور اپنے خون جگر سے اس خاکے میں رنگ بھریں گے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنے مقالہ کو اس شعر پر ختم کیا۔

فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن ☆ قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

تو مجمع میں ایک جھرجھری سی پیدا ہو گئی، یہ مقالہ اپنے وزن اور وقار کی وجہ سے بڑی توجہ اور

خاموشی سے سنا گیا، اس پر کسی نے سوال نہیں کیا، شاید اس لیے کہ اس میں کوئی متنازع فیہ بات نہیں تھی، یہ ایک علمی، تحقیقی اور تاریخی رنگ کا مقالہ تھا، جس میں قیمتی اور مخلصانہ مشورے بھی تھے اور یہ وہاں دیئے جارہے تھے جہاں علما کا سنجیدہ طبقہ بھی تھا، اس میں جدید طبقہ کے جذبات کی ترجمانی بھی ہے کہ وہ اس ترقی یافتہ دور میں اپنے ذہنی، قلبی، نظری اور فکری تسکین کے لیے اپنے ارباب فکر سے کس قسم کی توقع رکھتا ہے، امید کہ یہ آواز جس اخلاص سے اٹھائی گئی ہے اسی اخلاص سے سنی بھی جائے گی، مگر اسلامی علوم و فنون اوران کے ماخذوں کی کمی کا احساس بھی زیادہ صحیح نہیں، تیرہ سو سال کے اندر اسلام اور اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ اگر ان کا مطالعہ خاطر خواہ طریقہ پر کیا جائے تو ان تمام غلط نظریات کی تردید اور اصلاح ہوجائے جو کسی مقصد کی خاطر پھیلائے گئے ہیں اور اب تو اسلامی ادارے، اسلامی سینٹر اور اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جابہ جا اتنے قائم ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ہر قسم کا لٹریچر مہیا ہو رہا ہے، ان میں نیا کلامی رنگ بھی ملے گا، صرف ان کو زیادہ سے زیادہ عام کر کے ان میں توانائی اور آب و رنگ پیدا کرنے کی ضرورت ہے، فقہ اسلامی کی جدید تدوین کے سلسلہ میں بھی کافی لٹریچر مہیا ہو رہا ہے، اس میں اگر باضابطگی اور باقاعدگی پیدا کردی جائے تو یہ مشکل آسانی سے خود بہ خود حل ہو جائے، مگر ذہنی تسکین کا مسئلہ کبھی ایسی خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے کہ مذہب، مذہب کی اساس اور مذہب کی روح قربان ہو کر رہ جاتی ہے، جیسا کہ آج کل کی مغربی دنیا میں ہو رہا ہے، وہاں مختلف قسم کے نظری اور فکری خیالات کے انبار کے نیچے مذہب بالکل دب کر رہ گیا ہے، رہا مستشرقین کی علمی بدیانتیوں کو ظاہر کرنے میں ذہنی اضمحلال کا سوال تو اس پر اس زاویۂ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کی بہ ظاہر معروضی تحقیقات کا جواب معروضی انداز میں اگر دیا جائے تو یہ علمی اور تحقیقی خدمت بھی ہے، ان مستشرقین پر یہ بھی ظاہر کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے ظنیات کو یقینیات کا درجہ دے کر اور اپنے نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات میں سلسلۂ معلولات پیدا کر کے علم اور تحقیق جیسے مقدس اور معصوم فن کو کس قدر مجروح کر رہے ہیں، خود بھی گم راہ ہو رہے ہیں اور دوسروں کو بھی گم راہ کر رہے ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی : مولانا کا مقالہ ''پروفیسر اجناس گولڈ زیہر'' پر تھا، وہ اس کا کچھ حصہ ہی پڑھ

سکے، شروع میں یہ بتایا کہ ان کی ولادت ہنگری کے ایک شہر میں ۱۸۵۰ء میں ہوئی، پانچ برس کی عمر میں عہد عتیق کے عبرانی ایڈیشن کا مطالعہ شروع کیا، آٹھ برس کی عمر میں پوری تالمود پڑھ لی، بارہ برس کی عمر میں عبرانی زبان میں ایک مقالہ لکھا، پھر بوڈاپسٹ، لپزگ، برلن اور لیڈن میں مزید تعلیم پائی، لیڈن کے قیام میں اسلام کا مطالعہ اور اس پر تحقیق ان کی علمی زندگی کا نہایت اہم مشن بن گیا، جامعہ ازہر قاہرہ کے بھی وہ طالب علم رہے، اپنے وطن واپس آکر اسلام کا تحقیقی مطالعہ جاری رکھا، جب ۱۸۴۷ء میں وائنا کی امپریل اکیڈمی میں ان کے علمی کارنامے کی اشاعت ہوئی تو علوم شرقیہ خصوصاً اسلام اور اس کے متعلقات کے ایک جدید طرز کے محقق کی حیثیت سے ان کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھنے لگیں، معاشی ضرورتوں سے مجبور ہوکر وہ یہودی کمیونٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے مسلسل تیس برس ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۴ء تک کام کرتے رہے، مگر اپنی علمی تحقیقات بھی جاری رکھیں، ۱۹۰۴ء میں وہ بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں سامی زبانوں اور ان کے ادبیات کے پروفیسر ہوگئے، پھر اسلامی فقہ کے شعبے کے صدر ہوئے، ان کے تحقیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن چند معرکۃ الآرا کتابیں یہ ہیں (۱) فرقۂ ظاہریہ (۲) اسلامیات کا مطالعہ (۳) اسلامی دینیات اور قانون (۴) مذاہب التفسیر الاسلامی میں، تفسیر قرآن کی مختلف مناہج سے بڑی محققانہ بحث ہے۔

پھر مولانا نے گولڈ زیہر پر جو عام تبصرہ کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے: گولڈ زیہر یہودی تھے، ان کے زمانہ میں یہودی خود عیسائیوں کے ستم دیدہ تھے، اور یوں بھی یہودی مذہبی معاملات و مسائل میں اپنے آپ کو عیسائیوں کی بہ نسبت مسلمانوں سے زیادہ قریب سمجھتے تھے، ان وجوہ کے باعث گولڈ زیہر نے اسلامیات پر جو کچھ لکھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا لکھا کہ اس میں عبقریت کی شان نظر آتی ہے، ان کی غلطیاں دو قسم کی ہیں، (۱) مستشرقانہ غلطیاں (۲) علمی غلطیاں، مستشرقانہ غلطیوں کے سلسلہ میں ہم کو بنیادی طور پر یہ باور کرلینا چاہئے کہ کوئی مستشرق خواہ کیسا ہی انصاف پسند اور اسلام کی رفعت و عظمت کا دل و جان سے قائل ہو، وہ بہ ہر حال غیر مسلم ہے، اس بنا پر وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کرتا ہے، وہ بے شبہ ایک مسلمان کا نقطۂ نظر ہرگز نہیں ہوسکتا، اس کا سبب یہ ہے کہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لیے بعض جو بنیادی عقائد ناگزیر ہیں، اگر مستشرق بھی ان عقائد کا

حامل ہو تو وہ غیر مسلم ہی کہاں رہے گا، مثلاً نبوت کا تصور اور اس تصور کے ماتحت آنحضرت ﷺ کا مرسل من اللہ ہونا، علاوہ ازیں معراج نبویؐ اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا یہ اور اسی طرح کی چند اور باتیں ہیں جو مستشرقین عام طور سے تسلیم نہیں کرتے، گولڈ زیہر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، دوسری قسم کی غلطیاں جو گولڈ زیہر سے ہوئی ہیں وہ علمی غلطیاں یا تعبیر و بیان کی فروگزاشتیں ہیں، لیکن یہ چنداں تعجب انگیز نہیں اور نہ ان سے گولڈ زیہر کے بلند مرتبہ و مقام پر حرف آتا ہے، جو انہیں علم و تحقیق کی بارگاہ معلیٰ میں بہ جا طور پر حاصل ہے، اس موقع پر یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں تک ان کی مستشرقانہ غلطیوں اور فروگزاشتوں کا تعلق ہے، مسلمان تو مسلمان، زمانۂ حال کے بعض مستشرقین نے خود ان کا اعتراف کیا ہے اور ان کی طرف سے ان کی معذرت کی ہے، ان کی کتاب ''انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا'' پر برنارڈ لیوس نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''گولڈ زیہر اور ان کے ہم عصر مصنفین کو اس کا خیال ہی نہیں تھا کہ ان کی کتابوں کے قاری مسلمان بھی ہوں گے، اس لیے یہ لوگ اپنا مخاطب مغرب کے قارئین ہی کو بناتے ہیں، چنانچہ اس عہد کے دوسرے مصنفین کی طرح گولڈ زیہر بھی قرآن کو پیغمبرؑ اسلام کی تصنیف کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، مسلمانوں کے نزدیک ایسا کہنا اسلام کی سخت تنقیص ہے علاوہ ازیں اسلام پر لکھنے والے عام مغربی مصنفین کی طرح گولڈ زیہر نے بھی قرآن و حدیث میں عہد جاہلیت اور بعض اجنبی اثرات پر بحث کی ہے یہ موضوع بھی حساس مسلمانوں کے لیے سخت تکلیف دہ ہے، اس بحث میں گولڈ زیہر نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اب سے ایک سو برس پہلے تو استعمال ہوتی تھی لیکن مستشرقین اب ایسی زبان استعمال نہیں کرتے جو مسلمانوں کے لیے آزردگی کا سبب ہو، برنارڈ لیوس نے گولڈ زیہر کی ''انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا'' کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اپنے زمانہ کی پیداوار ہے، چند مباحث اور وہ بھی زیادہ تر تفصیلات و تشریحات کے معاملہ میں گولڈ زیہر کی تحقیقات کو ان نئے معلومات اور دلائل کی روشنی میں رد و بدل کیا جاسکتا ہے، جو گولڈ زیہر کے بعد سے اب تک حاصل ہو چکے ہیں اور جن پر عصر حاضر کی تحقیقات نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، برنارڈ لیوس ان غلطیوں اور فروگذاشتوں کو سامنے لا کر یہ بھی لکھتا ہے کہ گولڈ زیہر نے اسلامی عقائد اور مسلمانوں کے کارناموں کے ساتھ جس غیر معمولی ہم دردی کا جا بہ جا اظہار کیا ہے، وہ نہایت اہم ہے، ان کے

معاصرین اور پیش رو مصنفین میں سے جن لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے اور ان میں ردو بدل کر کے اسلام پر اعتراضات کئے تھے، گولڈ زیہر نے ان لوگوں کی پردہ دری کر کے اسلام کی حقانیت، اصلیت اور ان کے استناد کو ثابت کیا، اس سلسلہ میں وہ عیسائیت کے ان علما کے خلاف بھی سخت احتجاج کرتا ہے جو عیسائیت پر بحث کرتے ہیں، تو اپنی یک طرفہ عقلیت پر بھروسہ کر لیتے ہیں، لیکن جب وہ اسلام پر گفتگو کرتے ہیں تو اس کے لیے معیار تنقید بہت سخت اختیار کر لیتے ہیں۔

پروفیسر برنارڈ لیوس نے گولڈ زیہر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ بڑی بات تو یہ ہے کہ عرب علمائے اسلام کا بھی نقطۂ نظر یہی ہے، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ علمائے عرب نے گولڈ زیہر کی دو کتابوں کے ترجمے ''مذاہب التفسیر الاسلامی'' اور ''العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام'' تاریخ التطور العقدی والتشریعی فی الدین الاسلامی'' کے نام سے کئے، اول الذکر ترجمہ قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر عبدالعلیم النجار کا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ قرآن مجید کے درس و مطالعہ کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے اعتبار سے اسلامی ثقافتوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کے واحد اور منفرد اور ایک بالکل نئے طرز کا کارنامہ ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض دینی عواطف و جذبات کی تشریح میں دوسرے مستشرقین کی طرح گولڈ زیہر سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں، یہ علمی اغلاط سے بھی خالی نہیں ہے، لیکن گولڈ زیہر کو ایک عالم اور محقق کی حیثیت سے جو بلند مرتبہ حاصل ہے اس کو ان غلطیوں سے نقصان نہیں پہنچتا، مذکورۂ بالا دوسرا ترجمہ مصر کے ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر اور پروفیسر عبدالعزیز عبدالحق نے مل کر کیا ہے، اس ترجمہ کے مقدمہ میں ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے مستشرقین پر عام تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یورپ کے جن علما نے اسلام اور مسلمانوں پر کسی حیثیت سے خامہ فرسائی کی ہے، ان میں دو طبقے ہیں، ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنی خواہشات کے بندے تھے، اس لیے یہ خود بھی گم راہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گم راہ کیا، لیکن ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا جو انصاف پسند تھا، ان لوگوں کو تحقیق و تدقیق کے بعد جو بات حق نظر آئی، اسے برملا کہا، گولڈ زیہر کا شمار اسی طبقہ سے ہے، پھر ان کی کتاب ''انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا'' کے بارہ میں لکھا کہ رسول اللہ ﷺ عقیدہ اور شریعت کے نشو و نما اور عہد بہ عہد اس کا ارتقا، زہد اور تصوف، مختلف اسلامی فرقے، مذہبی

تحریکات اور ان کے اسباب وعلل، ان سب کا وسیع مطالعہ پیش کرتی ہے، اس کتاب میں انہی مراجع سے کام لیا گیا ہے، جو معتبر ہیں اور ان سے استفادہ کرنے میں مصنف کی غیر معمولی ذہانت اور گہری بصیرت معاون رہی ہے، لیکن اس کتاب میں غلطیاں بھی کم نہیں ہیں، اس کے وجوہ متعدد ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ غیر مسلم ہونے کے باعث وہ اسلام کے مبادی، اصول اور اصلی روح تک پہنچنے سے قاصر رہا، اس کے بعد مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بتایا کہ فاضل مترجمین نے ایک طرف تو افادۂ عام کی غرض سے بڑی محنت سے گولڈ زیہر کی کتابوں کو عربی جامہ پہنایا، دوسری طرف اس کی نوع بہ نوع غلطیوں اور فرو گذاشتوں کی نشاندہی کر کے ان کی تصحیح بھی کی، آخر میں مولانا نے اپنے سامعین کو مخاطب کر کے کہا کہ جو روش علمائے عرب نے پروفیسر گولڈ زیہر کی نسبت اختیار کی ہے، وہی روش ہمیں دوسرے مستشرقین کے متعلق اختیار کرنی چاہئے۔

مولانا تقی الدین کا تبصرہ : جب یہ مقالہ ختم ہوا تو ابوظبی کے نمایندہ مولانا تقی الدین مظاہری ندوی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

حضرت مولانا نے اپنے مقالہ میں گولڈ زیہر کے سلسلہ میں علمائے عرب کے بیانات نقل کر کے ان کو سراہا ہے، مگر مجھے تعجب ہے کہ مولانا کی نگاہ سے عرب علما میں ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی کتاب "السنة ومکانتها في التشريع الاسلامي" نہیں گذری، اس میں ڈاکٹر صاحب نے گولڈ زیہر کے افکار و نظریات کا پوسٹ مارٹم کیا ہے، میں وقت کی تنگی کی وجہ سے صرف دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

گولڈ زیہر نے امام زہری کا یہ قول نقل کیا ہے:

ان هؤلاء الامراء اکرهونا علی کتابة احادیث.	ان امرائے بنو امیہ نے ہمیں ایسی حدیثیں تحریر کرنے پر مجبور کیا۔

اس میں احادیث کے لفظ میں انہوں نے سراسر تحریف سے کام لیا ہے، اور الاحادیث کو احادیث کر دیا ہے، ان کا مقصد یہ ہے کہ جب حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے تدوین حدیث کے لیے امام زہریؒ کو مقرر کیا تو ابتدا میں وہ اس پر راضی نہیں ہوئے، مگر بعد میں راضی ہو گئے، یہ گولڈ زیہر کی تحقیق کے بجائے سراسر تحریف ہے کہ امام زہریؒ نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان امرا نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم

اپنی طرف سے ایسی ایسی حدیثیں بنا کر پیش کریں جن سے بنی امیہ خوش ہوں، گولڈزیہر نے ایک کارنامہ تو یہ انجام دیا، دوسری مثال جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ حافظ ذہبیؒ کا یہ قول ہے:

لم یجتمع علماء هذا الشان علیٰ تضعیف ثقة ولا علی توثیق ضعیف	علمائے فن کا کسی ثقہ کو ضعیف قرار دینے اور کسی ضعیف کی توثیق کرنے پر اتفاق نہیں۔

امام ذہبی تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس راوی کے ضعیف ہونے پر علما کا اتفاق ہو، اس میں کلام ہی نہیں، اسی طرح جن کے ثقہ ہونے پر اتفاق ہے ان میں بھی کوئی کلام نہیں، کلام ان رواۃ میں ہے جن کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ ثقہ ہیں یا ضعیف، لیکن گولڈزیہر نے اس کا یہ مطلب نکالا ہے کہ رواۃ میں کوئی ایسا راوی ہی نہیں ہے جن پر علمائے فن کا اتفاق ہو، گویا وہ کتب رجال کے سارے ذخیرے ہی کو مشکوک قرار دینا چاہتے ہیں، ان کے یہاں اس طرح کی اور مثالیں بھی ہیں، مولانا سے درخواست ہے کہ وہ علمائے عرب میں ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی یہ کتاب بھی پیش نظر رکھیں، تاکہ گولڈزیہر کی تلبیسات کا اندازہ ہو اور معلوم ہو کہ انہوں نے اسلامی حقایق کو کس طرح مسخ کیا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس کا جواب دینا چاہا لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے مباحثہ روک دیا گیا پھر اس اجلاس کے صدر ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی تقریر عربی میں شروع ہوگئی۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی : صدر صاحب نے پہلے مقالہ نگاروں کے مقالات پر اپنے خیالات ظاہر کیے جس کو سن کر اس حیثیت سے تعجب ہوا کہ وہ اردو نہ جاننے کے باوجود ان کے مطالب سے کچھ نہ کچھ واقف ہو گئے تھے، ان کی رائے تھی کہ ایک ایک مستشرق پر علاحدہ علاحدہ مضمون لکھنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اہل نظر کے سامنے آجائے گا، پھر انہوں نے فرمایا کہ قدیم مستشرقین نے سیرت، حدیث، تاریخ، تصوف اور تمدن اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور جدید مستشرقین کے جو خیالات و افکار ہیں، ان سب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، انہوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ آج کل یہ مستشرقین خود آپس ہی میں دست و گریباں ہیں، ایک داہنے جانب ہے تو دوسرا بائیں جانب ہے اور وہ ایک دوسرے کی تردید و تنکیر میں لگے ہوئے ہیں، اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے، کیوں کہ اس طرح ہم کو ایک بڑی جنگ لڑنے سے بچنے کا موقع فراہم ہو گیا ہے، صدر موصوف نے اس

طرف بھی توجہ دلائی کہ مستشرقین کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے، جتنا مستشرقین کے تلامذہ کا ہے، جواب ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں، اور ان مستشرقین ہی کے دماغ وعقل سے سوچتے ہیں، وہ اس لحاظ سے نسبۃً زیادہ خطرناک ہیں کہ وہ مسلمان ہوتے ہیں، ان کی تحقیقات وتالیفات مسلمانوں کے حلقوں میں بہت جلد پہنچ جاتی ہیں اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس پر اعتماد بھی کرلیا جاتا ہے، ایسے افراد کا مقابلہ بھی کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

اس تقریر کے بعد پہلی نشست ختم کی گئی۔

۲۲رفروری ۱۹۸۲ء کی صبح کی نشست کی صدارت ندوۃ المصنفین کے صدر جناب مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے کی اور اس کی کاروائی کو آگے بڑھانے کے فرائض ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے انجام دیئے، سب سے پہلے اس نشست میں ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب قطر یونیورسٹی نے اپنا مقالہ "المستشرقون والتاریخ" کے عنوان سے پیش کیا، اس کا خلاصہ جناب مولوی محمد رضوان ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلما نے پیش کیا، جس سے ان کی علمی صلاحیت کا بھی اندازہ ہوا۔

ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب : ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب نے فرمایا کہ ندوہ اور اس کے فارغین نے مستشرقین کے افکار کے متعلق اس وقت کام شروع کیا، جب کہ دنیا میں افکار ونظریات کی ایک کشمکش تھی، استشراق کی تحریک میں تطور ہے، مستشرقین نے پہلے تو علوم اسلامیہ کو اپنی زبان میں منتقل کیا اور ان کی نشرواشاعت بھی کی، لیکن بعد میں ان کا نقطۂ نظر بدل گیا، انہوں نے ایسی کتابوں کی نشرواشاعت کی جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے مضر تھیں، ان کی وجہ سے مسلمانوں کی نئی نسل میں غلط خیالات پھیلے، تحریک استشراق ایک طرح سے مسلمانوں کو ان کے ماضی سے متنفر کرنے کے مترادف ہے، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ استشراق ایک علمی تحریک ہے، مگر یہ امر واقعہ نہیں، اس کے اصل مقاصد اور ہیں، جن کے تحت یہ تحریک کام کررہی ہے، مستشرقین پر صرف الزام تراشی کافی نہیں، بلکہ ان کے زہر کا تریاق پیش کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں اس بات سے خوشی ہے کہ دارالمصنفین کی خدمات اس لحاظ سے نہایت قابل قدر ہیں کہ اس نے اسلامی تاریخ کو زیادہ سے زیادہ معتبر بنا کر لکھوایا اور طبع کرایا، مستشرقین کا خاص نشانہ اسلامی تاریخ ہی ہے، جس کو انہوں نے محرف اور مسخ کرنے کی دانستہ کوشش کی، اسلامی تاریخ نے

غیر اہم واقعات کو اہم بنادیا اور اہم واقعات میں برے پہلو دکھائے، اسلامی تاریخ کے بہت سے ایسے واقعات ہیں جن کی واقعیت اور حقیقت میں کلام ہے، لیکن مستشرقین کے نزدیک انہی کی اہمیت ہے، اسلام اور مسلمان مخالف تحریکوں کو انہوں نے مرکزی حیثیت دے دی، اسلامی تاریخ میں جو فتنے اٹھتے رہے، وہ ان کی نظر کو بھائے اور انہی کو اہمیت دے کر مسلمانوں کو اصلی اسلامی فکر سے دور کرنے کی کوشش کی، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مستشرقین کی کتابوں میں جو غلطیاں ہیں وہ سامنے لائی جائیں پھر اسکول اور کالج کے طلبہ کے لیے معیاری کتابیں اس طرح لکھی جائیں کہ ان کی عمر کے لحاظ سے تاریخی واقعات تو دیانت داری کے ساتھ پیش کیے جائیں، لیکن دین کی خیر خواہی بھی ملحوظ رکھی جائے، تاکہ مسلمان طلبہ کے ذہن کی صحیح تربیت ہو، مثلاً واقعۂ جمل اور واقعہ تحکیم کو اس طرح نہ لکھا جائے کہ اس کا تہائی تو ان واقعات کے لیے صرف کیا جائے جس میں صرف انتشار اور ہنگامے رہیں اور دوسرا حصہ بھی اسی انتشار پر رائے زنی سے متعلق ہو، اگر ایسا کیا گیا تو دو تہائی حصہ ذہن میں صرف الجھن پیدا کرنے والا ہوگا، یہ تو مناسب نہیں کہ تاریخی واقعات لکھنے میں اختراع سے کام لیا جائے، لیکن اس کا خیال ضرور رکھا جائے کہ مستشرقین بڑی چابک دستی بلکہ سبک دستی سے واقعات کا انتخاب اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو وہ نہایت سیاہ اور تاریک نظر آئیں، ایسے ادارہ کے لیے جہاں تاریخ نویسی کا کام ہو رہا ہے، ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر ہر سطح کے معیار کے مطابق معتبر تاریخ لکھ کر پیش کی جائے۔

جب یہ مقالہ ختم ہوا تو ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے اعلان کیا کہ جناب عبدالکریم ساتو صاحب جاپان سے آگئے ہیں، وہ مکہ مکرمہ کی مسجد کونسل کے ممبر ہیں اور جاپان میں اسلام کے بہت بڑے داعی اور مبلغ ہیں، وہ اس مجلس میں تشریف فرما ہیں، ان کو مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کرسی کے بغل میں اسٹیج پر جگہ دی گئی۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی: دوسرا مقالہ جامعہ ملیہ کے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا مشہور مستشرق سر ہملٹن گب پر تھا ان کا پورا مقالہ تو معارف کی کسی آئندہ اشاعت میں شائع ہوگا، لیکن اس میں سے وہ اس نشست میں جو کچھ پڑھ چکے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

پروفیسر صاحب نے فرمایا، مشرق کے مذاہب اور ان کے تہذیب و تمدن کے مطالعہ کے لیے

مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں، ان کے مقام و مرتبہ کا ہمیں احساس ہے، اس میدان میں ان کی کاوشوں نے استشراق کو علم کا ایک ممتاز، عظیم اور وقیع شعبہ یعنی ایک مخصوص ڈسپلن بنادیا، مستشرقین نے علم کے ایک بڑے خزینہ کو جو وقت کے دبیز دھندلکوں میں دفن تھا، نکالا، نادر و نایاب کتابوں کا پتہ چلایا، انہیں حاصل کر کے ان کا مطالعہ کیا اور ان میں بہت سی نادر کتابوں کو ایڈٹ کر کے نہایت اہتمام سے شائع کیا، ان پر حواشی لکھے اور بعض کی شرحیں بھی کیں، مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے شائع کئے، جن سے مشرق و مغرب کے علماء و محققین نے استفادہ کیا، انہوں نے تحقیق و تنقید کے ارتقا پذیر اصولوں اور طریقوں کی مدد سے اپنے تحقیقی کام کو علمی مقاصد کی خاطر باوقار بنانے کی کوشش کی، اس کے علاوہ تہذیبوں اور مذہبوں کے مطالعہ میں انہوں نے دوسرے علوم مثلاً لسانیات، علم الالسنہ، فلسفہ، تاریخ اور سماجی علوم سے بھی مدد لی، اس طرح علم الاستشراق کو انٹر ڈسپلنری علم بھی بنادیا، ایسے مستشرقین کی علمی خدمات کا اعتراف ہے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ان کے علمی کارناموں میں جو کئی لحاظ سے قابل قدر ہیں، سب سے بڑی کم زوری ان کی موضوعیت اور داخلیت ہے، انہوں نے دعویٰ تو کیا معروضی مطالعہ کا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا نہیں جو اپنے ذہنی تحفظات اور مذہبی تعصّبات سے دامن بچا سکا ہو، خاص طور سے اسلام، قرآن، پیغمبر اسلام ﷺ اور قانون اسلام سے متعلق ان کا مطالعہ غیر معروضی ہی نہیں بلکہ اکثر مستشرقین کے یہاں ان کا تعصب صاف طور پر نمایاں ہے، مستشرقین میں ایک تعداد یہودیوں کی ہے، مگر بڑی تعداد عیسائیوں کی ہے، اس کے سیاسی اور تاریخی اسباب ہیں، یہ لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے نفرت اور تعصب کی جن روایات کے وارث ہیں، اس کی داستان صدیوں پرانی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ داستان چودہ سو برس پر پھیلی ہوئی ہے، اس میں کئی اتار چڑھاؤ ہیں، اس کے کردار بدلتے رہے ہیں، اس کے پلاٹ میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، لیکن داستان کا بنیادی نقطہ ایک اور صرف ایک رہا ہے، بیسویں صدی کے تیسرے دہے اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد مستشرقین کے رویہ میں بھی تبدیلی ہوئی، اس تبدیلی کے سیاسی اور معاشی اسباب ہیں، لیکن اس زمانہ میں علم الاستشراق کا انحطاط علمی اعتبار سے ہوا اور اب مستشرقین میں ایسے عالم نہیں ملتے، جیسے کہ انیسویں اور بیسوی صدی کے اوائل میں تھے، بس ایک سنجیدہ اور بردبار مستشرق نظر آتا ہے، جس

کا علم بھی گہرا ہے اور نظر بھی دقیق ہے مگر وہ بھی مکمل طور پر غیر جانب دار نہیں ہے، اس کی بعض تحریروں میں اس کے نظریات اور خیالات کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو اسے اپنے پیش رووں سے ورثہ میں ملے ہیں، ہماری مراد سر ہملٹن گب سے ہے، علمی دنیا نے گب کے علمی کارناموں کا خوب خوب اعتراف کیا، کئی اعزاز بھی ان کو ملے، کئی علمی اور ادبی سوسائٹیوں کے ممبر بھی رہے، ان کے مضامین کی فہرست بھی خاصی طویل ہے، مغرب میں ان کے عقیدت مندوں نے انہیں صف اول کے اسلامی اسکالرس میں شمار کیا ہے، مسلمان بھی ان کی محققانہ بصیرت اور مورخانہ ژرف نگاہی کے قائل ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کتابیں ان کے وسیع مطالعہ، تشریح کی غیر معمولی صلاحیت، فکر کی شادابی اور گہری بصیرت کی شاہد ہیں، انہوں نے جدید عربی کے ارتقا پر بھی مضامین لکھے، جس میں اس زبان وادب کے جدید رجحانات پر سیر حاصل بحث کی ہے، وہ اپنے معاصر مستشرقین کے مقابلہ میں عربی زبان وادب سے کہیں زیادہ واقف تھے، بلکہ اس سے گہرا تعلق بھی رکھتے تھے، ان کے ایک مضمون اسلامک بایوگرافیکل لٹریچر سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام اور تاریخ اسلام کے مطالعہ میں عربی ادب کے وقیع مطالعہ کو کتنی اہمیت دیتے تھے، وہ عربی ادب کے شیدائیوں میں تھے، ابن خلدون کا چالیس برس تک مطالعہ کیا اور اسی سے علم وآگہی اور مسرت وانبساط حاصل کرتے رہے، اس کے ادبی محاسن کا ذکر انہوں نے کچھ اس طرح کیا ہے کہ ان کی نظروں میں ابن خلدون اپنے تخیل کے ساتھ ایک حیات آفریں، رنگین اور رعنا شخصیت کے مالک ہیں، وہ اس کی تحریروں کو معنوی لذت سے پھیکا قرار دیتے ہیں، مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی طلاقت لسانی سے فراوانی کا احساس ہوتا ہے، اس کے خیالات آبشار کی طرح گرتے نظر آتے ہیں، کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پر جوش بے ربطی کے ساتھ نیم ظلمتوں میں کھو جاتا ہے، لیکن اپنی خوش وضع اور خوش آہنگ نثر میں اس کی بڑی قدرت ظاہر ہوتی ہے، جملوں کی تراکیب، فقروں کی ترتیب، چست ونفیس تنظیم اس کے قابو میں رہتی ہے، وہ اپنے خیالات کا اظہار ایسی تربیت یافتہ شائستگی ولطافت سے کرتا ہے کہ اس کی تحریر کی معنویت اس کے دلائل کے تابع ہوجاتی ہے، اس کا خاص میدان تاریخ وتمدن ہے، ان دونوں کے ارتقا ونشو ونما میں زبان وادب کے رول کی اہمیت سے وہ اچھی طرح واقف ہے، تاریخ وتمدن کے موضوعات پر گب کے کچھ اپنے نظریات تھے، اسی لیے

واقعات کو اپنے انہی نظریوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ عربوں کے قبائل کی مخالفت، فوجی طاقت کے ذریعہ سے دبا دینے سے کوئی مناسب اور مستقل حل حاصل نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ عرب کے قبائل اگر اسلام میں پورے طور سے داخل نہ ہوں تو کم از کم اسلام کے جزوی مفاد سے اپنے آپ کو وابستہ کرلیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت مکی سرداروں کی قیادت میں قبائل کو شام کی سرحدوں پر حملے کے لیے بھیجا، مقصد یہ تھا کہ قبائل کا رخ دوسرے ملکوں کی طرف پھیر دیا جائے، اس میں کام یابی ہوئی اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا، گب اس طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بدوی قبائل نے اسلام کو انسانی، اخلاقی و روحانی اصولوں کی بنا پر نہیں اپنایا بلکہ جب انہوں نے دیکھا کہ اس سے ان کا دنیوی و مادی مفاد وابستہ ہے تو اسلام سے ان کا تعلق پیدا ہوگیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے گب نے اپنے ذہن میں ایک کلیہ قائم کیا اور شام و عراق کی اسلامی فتوحات کو اسی کلیہ سے دیکھنے کی کوشش کی، ہمارے نزدیک یہ رویہ تاریخ نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق نہیں ہے، اس سے تحقیق کی معروضیت کا وقار مجروح ہوتا ہے، جس پر یورپ کے جدید محققین ناز کرتے ہیں، یہی رویہ گب کا علم حدیث کے بارے میں ہے، وہ اپنے ایک مضمون میں اپنے حسن بیان اور مخصوص طرز استدلال سے مسحور کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے چونکہ اسلامی قوانین اور ان کے نفاذ کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہوگیا تھا، خلافت کے مختلف شہروں اور صوبوں میں مقامی علما اپنی اپنی فہم کے مطابق یہ آزادانہ رائے دیتے تھے، جو بسا اوقات باہم مختلف اور متضاد ہوتی تھی، اس تضاد سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو علما نے خطرناک تصور کیا، اس مسئلہ کا انہوں نے یہ حل ڈھونڈا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے معاصرین کے واسطہ سے احادیث بیان کرنا شروع کردیں، جن میں واضح مسائل سے متعلق روایتیں حضرت محمد ﷺ سے منسوب ہوتی تھیں، ان کی پابندی کو ضروری قرار دیا اور ان کی حیثیت آیات قرآنی سے کم تر نہیں سمجھی گئی اور جب گب حدیث اور تدوین حدیث کا ذکر کرتے ہیں تو اس کو علما کی مصنوعی تخلیق سے تعبیر کرتے ہیں، اس طرح وہ حدیث کی اہمیت کو اپنے مسلمان قارئین کی نظر میں کم کرنا چاہتے ہیں اور یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ پروفیسر گب کو سلطان

صلاح الدین ایوبی کی شخصیت سے گہرا شغف ہے، انہوں نے بارہویں صدی کی اس پرکشش اور غیر معمولی شخصیت کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان پر جو مضامین لکھے، وہ جدید طرز کی تحقیق کے اعلیٰ نمونے ہیں، ان کے خیال میں سلطان صلاح الدین ایوبی ایسی شخصیتوں میں نہیں تھے جو محض اپنے گرد و پیش کے حالات کی پروردہ ہوتی ہیں، بلکہ خود ایک بڑے مقصد کے لیے اپنے دینی اخلاق کے سہارے نہ صرف حالات کو اپنے موافق بنایا، بلکہ نئے حالات بھی پیدا کئے اور سیاسی انحطاط اور اخلاقی زوال کے اس عہد میں اسلام اور مسلمانوں کی آبرو باقی رکھی، پروفیسر گب نے لکھا ہے کہ اس عہد کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی ایسے مستند ماخذ ملتے ہیں جن کی مدد سے صحیح اور مثبت نتیجے نکالے جا سکیں اور جو تاریخ و تنقید کے سخت سے سخت معیار پر کھرے ثابت ہوں، لیکن سلطان صلاح الدین کی زندگی سے متعلق خوش قسمتی سے عربی زبان میں اسی زمانہ کے پانچ مراجع دست یاب ہیں، گب نے ان پانچوں کتابوں کو ہر پہلو سے جانچا ہے اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو تحقیق کے اعلیٰ معیار کے مطابق پرکھا ہے، وہ ان سے استفادہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پہلی بار دیکھنے میں آیا کہ ایک مسلم حکم راں مسلسل تین سال تک میدان جنگ میں اپنی افواج کے ساتھ اپنے مستعد دشمن کے مقابلہ میں ڈٹا رہا، جب کہ اس عہد کا فوجی نظام ایسی طویل جنگ کا بہ مشکل ہی متحمل ہو سکتا تھا، ان کے خیال میں یہ صورت صرف اس لیے ممکن ہو سکی کہ باوجود اس کے کہ سلطان صلاح الدین کوئی ماہر جنگ یا تجربہ کار حکم راں نہ تھے، پھر ان کی ایک ایسی شخصیت تھی جو صلیبی حملہ آوروں کے خلاف مسلمانوں کے مختلف النوع عناصر اور باہم متحارب سیاسی قوتوں کو اتحاد اسلامی کے لیے ایک مرکز پر متحد اور مجتمع کر سکتی تھی، ہمت و شجاعت اور صبر و استقامت، ان سب اخلاقی خوبیوں سے وہ متصف تھے اور یہ سب ان کے کام بھی آئیں، لیکن ان کامیابیوں میں سب سے زیادہ اس بات کو دخل تھا کہ ان میں بے غرضی و بے لوثی، سخاوت و فیاضی اور اخلاق اسلامی کا احساس برتری ایسا تھا جنہیں انہوں نے دوست و دشمن سبھی کے ساتھ یکساں برتا، وہ سادہ لوح نہ تھے، لیکن ان میں غضب کا انکسار اور سادگی تھی، ان کی ایمان داری بے داغ تھی اور بلور جیسی چمک رکھتی تھی، ان کے دشمن اس بات پر حیران تھے کہ سیاست اور جنگ دونوں میں ان کے عزائم اور طور طریقے کیوں مختلف ہوتے ہیں، وہ مکر و فریب سے کوسوں دور تھے اور دوسروں کے مکر و فریب کو بھی شاذ ہی سمجھ پاتے تھے،

ان کے اسلامی اخلاق نے انہیں معاہدوں کا احترام کرنا سکھایا، وہ ہر قیمت پر معاہدوں کی پابندی کرتے تھے اور معاہدہ توڑنے والے دشمن کو ہمہ وقت یہ خیال رہتا تھا کہ اسے عہد شکنی کی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی، ہمارا خیال ہے کہ شاید کسی عیسائی مؤرخ یا سوانح نگار نے مستند ماخذوں کو اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد اور تاریخ وتنقید کے سارے اصولوں کو برت کر سلطان صلاح الدین کی ایسی خوب صورت اور سچی تصویر پیش کی ہوگی جیسی گب نے کی ہے، لیکن تاریخ وادب سے ہٹ کر جب گب قرآن پاک وسیرت رسول ﷺ کے موضوعات پر لکھتے ہیں تو اکثر مقامات پر اپنی تاریخی بصیرت اور علمی معروضیت سے بے وفائی کرتے نظر آتے ہیں، ان کے اس رویہ کی توجیہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد اور تعصب و جانب داری کی وہ روایت جوان کو اپنے علمی ماحول اور ورثہ میں اپنے پیش رووں سے ملی تھی، ان کا راستہ روک کر کھڑی ہوجاتی ہے، قبل اس کے دو تین مثالوں سے ہم اپنے اس خیال کی وضاحت کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے کچھ اقوال یہاں نقل کریں، وہ لکھتے ہیں کہ ان استعاروں میں سے جہاں عیسائی عقیدہ روایتی طور سے محفوظ ہے، ذہنی طور پر میری تشفی ہوجاتی ہے، کیوں کہ یہ استعارے اور علامتیں روحانی صداقتوں کی ان بلند ترین عظمتوں کی ترجمان ہیں، جہاں تک میرے فہم کی رسائی ہے، بہ شرطے کہ ان علامتوں اور استعاروں کی تشریح ایسی زبان میں کی جائے جس میں کسی تجسیمی اور تشبیہی عقیدہ کا اظہار نہ ہوتا ہو، بلکہ ایسے عمومی تصورات میں ان کا بیان ہو جو کائنات کے متعلق ہمارے بدلتے ہوئے نظریوں سے مطابقت رکھتے ہوں، قطع نظر اس کے کہ گب کے اس قول کا حقیقی مالہ وما علیہ کیا ہے، اتنی بات صاف ہے کہ وہ اپنی نظر میں پکے عیسائی تھے اور ہمارے نزدیک انہیں اس کا حق تھا کہ جس عقیدہ سے انہیں ذہنی وروحانی تسکین حاصل تھی اسے وہ اپنائیں، مگر اس بات کی خوشی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بھی اس کا حق دیتے ہیں، اسی لیے ان سے توقع کی جاتی تھی کہ مسلمانوں کے عقائد اور حضور ﷺ کی سیرت اقدس پر لکھتے ہوئے انصاف سے کام لیں گے، ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں ان کی عیسائیت، تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی اس بنیادی خصوصیت پر غالب آگئی ہے، جسے آج سے صدیوں پہلے ایک مسلمان دانش ور اور عالم البیرونی نے الآثار الباقیہ اور کتاب الہند کے سلسلہ میں اپنایا تھا، دوسروں کے مذہبی عقائد ومذہبی روایت کے موضوع پر لکھنے کی آزادی ہے، کسی ایک

خاص مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کا مطالعہ کر کے اپنے نتائج کو قلم بند کر سکتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں تصنیف وتالیف کا اولین اور بنیادی اصول یہ ہونا چاہئے کہ پہلے زیر مطالعہ مذہب کے ماننے والوں کے عقاید پوری وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کردیئے جائیں کہ شکایت کی کوئی گنجایش باقی نہ رہے کہ ان کے عقائد کو غلط طور پر یا توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا، اب اگر لکھنے والا کسی اور عقیدہ یا نظریہ کا حامل ہے یا اپنے نظریہ یا کسی اور کے نظریہ کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے، لیکن اسے چاہئے کہ وہ اپنے یا کسی دوسرے کے نظریہ کو الگ سے اور پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرے، افسوس ہے کہ مستشرقین قرآن پاک اور سیرتؐ رسول ﷺ پر لکھتے ہوئے اس بنیادی اصول کو عموماً فراموش کردیتے ہیں اور کچھ اس طرح کا خلط مبحث کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ جن کا اسلام کا مطالعہ اچھا ہے، یہ محسوس کرسکتے ہیں کہ لکھنے والا اپنے ذاتی خیال وعقیدت کو اپنے قاریوں کے ذہن میں بٹھادینا چاہتا ہے، حیرت یہ ہے کہ پروفیسر گبؔ جیسے بالغ نظر مصنف بھی، جس کی علمیت ومتانت کے بہت سے مسلمان بھی معترف ہیں، اپنا دامن اس عیب سے پاک نہ رکھ سکے، پروفیسر گبؔ نے اسلام پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے ایک کا نام ''محمڈن ازم'' ہے، مارگولیتھ نے اسی نام سے ۱۹۱۱ء میں ایک کتاب لکھی تھی، پروفیسر گبؔ نے اس خیال سے کہ بہ قول ان کے ۱۹۱۱ء کی علمی فضا اور تھی، نظریے اور تھے، جذبات اور تھے اور چوں کہ ہر دور کے ذہنی تحفظات وتعصّبات کی پرچھائیاں اس دور کی تحریروں میں باقی رہتی ہیں، خواہ ان سے بچنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے، اسلام پر ایک نئی کتاب لکھنا ضروری سمجھا، وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ بات پسند نہیں کہ انہیں محمڈن کہا جائے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اسلام کو محمڈن ازم کہنا ضروری سمجھا، ان کے خیال میں ایسا کہنا غلط بھی نہیں کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ مسلمان بڑے فخر سے اپنے آپ کو ''امت محمدیہ'' کہتے تھے، دوسرے یہ کہ جو مسلمان لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر اسلام پر اپنے یقین کا اقرار کرتے ہیں تو اس کلمہ کے دوسرے جز کی اہمیت ان کے ذہن میں تمام مضمرات کے ساتھ موجود رہتی ہے، جب کہ کلمہ کے پہلے جز پر مسلمانوں کے علاوہ بہت سے غیر مسلموں کا اعتقاد اور ایمان ہوسکتا ہے، اگر محمد ﷺ کے زمانہ سے لے کر اب تک کوئی ایسی مثال نہیں کہ اس کلمہ کے منکرین کو کبھی مسلمان کہا گیا ہو اور ان کو اسلامی برادری

کا رکن سمجھا گیا ہو، برخلاف اس کے راسخ العقیدہ مسلمان شارحین کا موقف ہر دور میں یہی رہا ہے کہ کسی ایسے شخص کو جو علانیہ طور سے کلمہ کا اقرار کرتا ہو غیر مسلم نہیں کہا جا سکتا۔

پروفیسر ضیاء الحسن نے اپنے مقالہ کا اتنا حصہ پڑھ کر کہا کہ بعض اور اہم پوائنٹ ہیں لیکن چوں کہ وقت نہیں ہے، اب آپ سوال کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید سلمان ندوی: اس مقالہ کے بعد پروفیسر مشیر الحق اپنا مقالہ پیش کریں گے، اس کے بعد سامعین سوال کر سکتے ہیں، وقت کم ہے، اس کے بعد چائے کا وقفہ بھی ہے، ڈاکٹر مشیر الحق کے مقالہ کا عنوان ''پروفیسر الفریڈ کانٹ ویل اسمتھ'' ہے۔

ڈاکٹر مشیر الحق ندوی: جناب صدر! مضمون کا جو ابتدائی حصہ ہے، میں نے اس میں پروفیسر کانٹ ویل اسمتھ کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات دی ہیں، ان کو وقت کی کمی کی وجہ سے چھوڑ رہا ہوں، مختصراً اتنا بتادوں کہ ان کی پیدائش کناڈا کے مشہور شہر ٹورنٹو میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی، اب تک تقریباً سو تحقیقی اور علمی مقالات اور لگ بھگ دس اہم کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے بعض مضامین اور کتابوں کے ترجمے عربی، ترکی، اردو، فرانسیسی، جرمن، انڈونیشی، جاپانی اور سویڈش زبانوں میں بھی شایع ہو چکے ہیں، کچھ وقت انہوں نے دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان میں لاہور کے فارمن کرسچین کالج میں ایک استاذ کی حیثیت سے گزارا، جہاں ان کو ہندوستانی مسلمانوں سے ملنے کا پورا اتفاق ہوا اور ان میں ایک خاص قسم کی تبدیلی یہ آئی کہ انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام کا صحیح اور مکمل مطالعہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ برصغیر کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ پورے طور سے نہ کیا جائے، صرف مڈل ایسٹ پر کنسٹریٹ کرنے سے صحیح اسلام کا پرسکٹیو نظر نہیں آ سکتا، انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''ماڈرن اسلام ان انڈیا'' لاہور ہی کے قیام میں ۱۹۴۳ء میں شایع کی، جس کا شمار آج بھی نیم کلاسیکی ادب میں کیا جاتا ہے، اسمتھ اس وقت تک تاریخ کے تجزیاتی مطالعہ میں مارکسی معیارات کو بنیادی جگہ دیتے تھے، جس کی جھلک اس کتاب میں صاف نظر آتی ہے، اس کتاب کی اشاعت کے بعد ان کو اپنے مارکسی نقطۂ نظر کی وجہ سے مذہبی عیسائی دنیا کی تنقیدوں کا ہدف بھی بننا پڑا، لاہور سے واپسی کے بعد انہوں نے پرنسٹن میں فلپ کے حتی کی نگرانی میں 'مجلۃ الازہر، تجزیہ وتنقید' کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے پی، ایچ، ڈی کی

ڈگری حاصل کی، ۱۹۴۹ء میں وہ کمپریٹیو ریلیجین کے پروفیسر ہوکر میک گل یونیورسٹی چلے آئے، جہاں دو ہی سال کے عرصہ میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد ڈالی، اور اس میں ان کا تقرر پروفیسر کی حیثیت سے ہوا، ان کا خاص نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ اسلام یا کسی بھی مذہب کے مطالعہ کے سلسلہ میں جب تک جس مذہب کا مطالعہ کیا جارہا ہو، اگر اس کے ماننے والے تقریباً اتنے ہی تعداد میں موجود نہ ہوں، جتنی تعداد میں دوسرے مذاہب کے ماننے والے موجود ہیں، اس وقت تک مذہب کا صحیح مطالعہ ایمان داری کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا، اسی بنیاد پر انہوں نے یہ شرط رکھی تھی کہ اپنے دوران قیام میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں اساتذہ وطلبہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا تناسب پچاس پچاس فیصد ہونا چاہئے، ۱۹۶۴ء میں ان میں یہ تبدیلی آئی کہ صرف اسلام کے مطالعہ کے بہ جائے دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب کا بھی مطالعہ کیا جائے، اس کے لیے میکگل کا میدان ان کے لیے ذرا محدود تھا، اس لیے وہ ہارورڈ چلے گئے، وہاں انہوں نے کئی مذاہب کا مطالعہ کرنا شروع کیا، اس کے تعلیمی سینٹر کو انہوں نے رہائشی سینٹر میں تبدیل کردیا، جہاں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے، یہ تو ان کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک تھی، اب میں ان کے خیالات کی بھی ایک جھلک پیش کرتا ہوں، اسمتھ اپنے فکر وعمل دونوں کے اعتبار سے خود بھی مذہبی ہیں اور دوسروں کو بھی ان کے مذاہب پر عمل پیرا دیکھنا چاہتے ہیں، تقویٰ ان کے خیال میں کسی مخصوص مذہب کی ملکیت نہیں یہ خدا اور انسان کے باہمی تعلق کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے، یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا، فرد کی مذہبی زندگی اتنی ہی قابل رشک ہوگی، اسمتھ کے نقطۂ نظر سے مذہب کی دو جہتیں ہوتی ہیں، ایک کو وہ انفرادی کیفیت کہتے ہیں اور دوسرے کو اجتماعی روایات، انفرادی کیفیت کو اسمتھ اپنی زبان میں (Faith) اور ہماری زبان میں ایمان کہتے ہیں، اگرچہ ایمان کی دولت کے بغیر کوئی شخص مذہبی نہیں ہوسکتا، لیکن ایمان کو ناپنے کا کوئی آلہ نہیں ہے، یہ چوں کہ ایک اندرونی کیفیت ہے، اس لیے ضروری نہیں ہے کہ ایمان میں حالات کے تحت تغیر وتبدل نہ ہوسکے اور نہ ہر شخص کے ایمان کا پلہ برابر ہوسکتا ہے، دوسرے لفظوں میں اسمتھ ایمان ہر کس بہ قدر ہمت اوست کے قائل ہیں، افراد کی سطح پر کمیت وکیفیت کے فرق کے باوجود مذہب کی دوسری جہت یعنی کسی مذہب کے پیروؤں کی اجتماعی روایات کا Conservative Tradition نام دیتے ہیں، ظاہر میں مشاہدہ

کیا جاسکتا ہے، اگر چہ ان میں زمان و مکان کے فرق کی وجہ سے تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، تاہم ان روایات میں چوں کہ ایک تسلسل ہوتا ہے، اس لیے وہ کسی مذہب کا مطالعہ کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور چوں کہ روایات، زمان و مکان کے فرق سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں، اس لیے اگر چہ اس جہت سے دیکھا جائے تو ایک سے زیادہ مذاہب کا وجود ثابت ہو جاتا ہے، لیکن اگر اندرونی کیفیت یا ایمان کو مذہب کا معیار مانا جائے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک سے زیادہ ایمان کا وجود ممکن ہے، ایمان کی اجتماعی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں، لیکن ایمان ہمیشہ واحد ہی رہے گا، اسے جمع کے صیغے میں استعمال نہیں کیا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ اسمتھ اپنی تحریروں میں Faith کو ہمیشہ واحد کے صیغہ میں لکھتے ہیں، اپنی پرانی تحریروں میں انہوں نے جہاں کہیں ضرورۃً جمع کے صیغہ میں لکھا تھا اسے دوبارہ اشاعت کے وقت Forms of Faith ایمان کی مختلف شکلوں میں بدل دیا، ایمان اسمتھ کے نزدیک ایک انفعالی کیفیت کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک معاہدہ ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے، جس کی رو سے وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ایمان کا اظہار ہوتا ہے اور یہ ایک شکل اختیار کر لیتا ہے، خدا پر ہمارا ایمان جتنا زیادہ مکمل ہوگا، اتنا ہی ہم اس کے تابع اور فرماں بردار بندے ہوں گے، اس اتباع اور فرماں برداری کو اسمتھ اسلام کہتے ہیں، اسلام ان کے نزدیک دراصل ایمان کے اظہار کا نام ہے، پیروی کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں، اگر ہم بات کو واضح کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے واسطے دو الگ الگ ہم معنی لفظ مسلم اور مسلمان استعمال کریں جن میں اول الذکر کو لغوی معنی میں لیں اور آخر الذکر کو اصطلاحی معنی میں تو پھر اسمتھ بلا کسی جھجھک کے انگریزی میں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں مسلمان نہیں ہوں، لیکن اسی بات کو وہ عربی میں مسلم کے لغوی معنی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے بارے میں لست بمسلم کہنے پر کبھی تیار نہ ہوں گے، کیوں کہ اس اعلان کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خدا کے فرماں بردار بندے ہیں اور یہ بات ان کے عقیدہ و عمل کے مطابق درست نہیں ہے، خدا کی مرضی کو وہ جس حد تک اپنی صلاحیتوں کے مطابق سمجھ پائے ہیں، اس کے تحت ان کی پوری زندگی ایک بندۂ مسلم کی زندگی ہے، لیکن اصطلاحی معنوں میں مسلم نہ کہنے کی ایک وجہ تو ان کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اتفاق سے کسی مسلم گھرانے میں پیدا نہیں ہوئے، دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے اس دعوی سے متفق نہیں کہ

اصطلاحی طور سے مسلمان ہوئے بغیر خدا کی مرضی کے آگے سر نہیں جھکایا جاسکتا، انہوں نے جس طریقہ سے اپنے کو خدا کے سپرد کیا ہے، وہی سپردگی ان کے نزدیک الاسلام ہے، کیتھولک انسائیکلوپیڈیا کی تشریح کے مطابق دین یا ریلیجن خدا کے حضور بندوں کی اختیاری سپردگی کو کہتے ہیں، پروفیسر اسمتھ کا اصرار ہے اگر ہم کیتھولک پادریوں یا دوسرے عیسائی علما کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھ لیں گے کہ وہ ریلیجن کی مذکورۂ بالا تعریف کے پیش نظر صبح وشام اپنی زبان میں اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ کا ورد کررہے ہیں، اس کے باوجود انہیں اس پر بھی اصرار ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں، گویا اسلام ان کا دین تو ہے، لیکن وہ خود مسلمان نہیں، یہ ظاہری تضاد بیانی اس وقت ختم ہوجاتی ہے، جب یہ واضح کردیا جائے کہ عیسائی علما اور پادری اور خود اسمتھ جس اسلام کو اپنا دین کہتے ہیں وہ اسلام سے قطعاً مختلف ہے، جو صدہا برس کے تاریخی وسماجی عوامل کے ایک خاص مذہبی طرز فکر کا مرادف بن گیا ہے، اسمتھ کو یقین ہے کہ اسلام کا جو مفہوم وہ سمجھ رہے ہیں، وہ قرن اول کے مسلمانوں کی تشریحات سے مختلف نہیں ہے، مثلاً طبری اور ان کے ہم عصر مسلمانوں کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ لوگ اسلام کا مفہوم اطاعت اور بندگی ہی لیتے ہیں، یہ تصور کہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے مکمل، جامع اور متعین نظام ہے، ان کے خیال میں کم از کم قرن اول کے مسلمانوں کے لیے اجنبی تھا، مثلاً قرآنی آیات وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ اور رَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا کی تشریح کرتے وقت طبری اسلام کا مطلب بتاتے ہیں، الاستسلام لامری والانقیاد لطاعتی علی ما شرعت لکم من حدود و فرائضه، دل چسپ بات یہ ہے کہ مسلمان بھی طبری کی اس تشریح سے اختلاف نہیں کرتے، کیوں کہ وہ بھی یہی سمجھتے ہیں، اسلام اور اللہ کی مقرر کردہ حدود وفرائض کی پابندی کا نام ہے اور اسمتھ بھی یہی کہتے ہیں، لیکن جب ہم اس سے آگے بڑھ کر تفصیلات میں داخل ہوتے ہیں تو ہم اور اسمتھ الگ الگ راہوں پر چل پڑتے ہیں، ہمارے نزدیک اللہ کی مقرر کردہ حدود وفرائض من وعن وہی ہیں جنہیں ہم شریعت اسلامیہ کہتے ہیں، اس لیے مسلمان ہونے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ انسان شریعت اسلامیہ کی بالادستی کو بھی قبول کرلے، اسمتھ کو ہماری تشریح سے اتفاق نہیں ہے، وہ اطاعت الٰہی کو شریعت اسلامیہ میں محدود نہیں سمجھتے، شریعت اسلامیہ اسمتھ کے نزدیک دراصل مذہب کے اس رخ سے تعلق رکھتی ہے جسے وہ اجتماعی

روایات کہتے ہیں، جس کا وجود ایک سے زیادہ شکلوں میں ممکن ہے۔

اسمتھ کو شماریات سے بھی کافی دل چسپی ہے اور نتائج نکالنے میں اس سے مدد لیتے رہتے ہیں، ایمان واسلام کی بحث میں یہ دکھانے کے لیے کہ اصل چیز ایمان ہے اور قرآن نے اسی پر زور دیا تھا، لیکن جیسے جیسے مسلم سماج منظم ہوتا گیا اور دوسرے مذاہب کی طرح ایک مخصوص مذہب کی شکل اختیار کرتا گیا، ایمان کے بہ جائے اسلام پر زور دیا جانے لگا، قرآن میں ایمان اور اسلام نیز ان کے مختلف مشتقات کی تعداد کی بنیاد پر اسمتھ نے ۸۵ (۸۵- $\frac{۱}{۱}$) اور ۱۵ (۱۴،۹٪) کی نسبت دکھائی ہے، اس کے بعد انہوں نے قرن اول اور زمانہ وسطی کی عربی کتابوں کے ناموں کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ۱۳۰۰ھ تک یہ نسبت ۸۵ اور ۱۵ کے بہ جائے ۴۰ اور ۶۰ کی ہو جاتی ہے، عہد جدید یا چودھویں صدی میں ایمان اور اسلام کا تناسب بالکل بدل جاتا ہے اور دونوں میں ۷ (۷،۱٪) اور ۹۳ (۹۲،۹٪) کی نسبت رہ جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید سلمان ندوی: ذرا وقت کا لحاظ رکھیں۔

پروفیسر مشیر الحق: کیا میرا وقت ختم ہو چکا ہے؟ میرے مقالہ میں اس مسئلہ پر کچھ روشنی ہے، جس میں یہ بحث اٹھائی گئی ہے کہ اسلام کو محمڈن ازم کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اسمتھ کو پوری طرح اصرار ہے کہ مسلمانوں کو مسلم اور اسلام کو اسلام ہی کہا جانا چاہئے اور اس سلسلہ میں وہ اتنے سخت رہے ہیں کہ اپنی تحریروں اور ریڈیو کی تقریروں کے ذریعہ تقریباً پچھلے چالیس پینتالیس برسوں سے اس پر زور دیتے رہے ہیں کہ مسلم ہی استعمال کیا جائے، بلکہ جس زمانہ میں پروفیسر گب کی کتاب محمڈن ازم شایع ہوئی تھی جس کی طرف پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے اشارہ کیا ہے، اسمتھ نے اس نام کو پسند نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ گب کی اس معذرت سے متاثر ہوئے تھے کہ یہ نام ان کی اپنی پسند سے نہیں بلکہ ناشر کی اپنی تاجرانہ پالیسی کی وجہ سے رکھنا پڑا ہے، لیکن اب اسمتھ آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اس معاملہ میں ان کا بے لچک اصرار شاید ضرورت سے کچھ زیادہ ہے اور گب کی کتاب کا عنوان بالکل بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا اور اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے جو ضیا صاحب اپنے مقالہ میں پیش کر چکے ہیں، کہ مسلمانوں کو آنحضرت ﷺ سے جو تعلق ہے اور کلمہ کا

جو دوسرا جز ہے اس پر جتنا اصرار ہے، اس کی روشنی میں اور خود مسلمانوں کی زندگی اور ان کی تحریروں کا مطالعہ کر کے انہوں نے پیش کیا ہے کہ مسلمانوں کو کوئی شخص محمڈن یا اسلام کو محمڈن ازم کہتا ہے تو پھر اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی بنیاد ہے، اس زبانی تقریر کے بعد پروفیسر مشیر الحق نے اپنے مقالہ کا آخری حصہ پڑھا جو یہ تھا:

آپ نے ایسے مضامین پڑھے ہوں گے جن میں ایک شاعر یا افسانہ نگار یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ افسانہ کیوں لکھتا ہے یا شعر کیوں کہتا ہے، اسمتھ نے اس قسم کا کوئی مضمون نہیں لکھا ہے، یا کم از کم میری نظروں سے نہیں گزرا ہے کہ وہ اسلامی موضوعات پر کیوں لکھتے ہیں، لیکن اگر اس سوال کا جواب ہم ان کی مختلف تحریروں میں تلاش کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ تو اتنے بد دیانت ہیں کہ دنیا کے سامنے اسلام کی غلط تصویر پیش کرنے کی خاطر اس میدان میں آئے ہیں اور نہ ہی اتنے خوش فہم ہیں کہ سمجھتے ہوں وہ اس طرح چند مسلمانوں کے دل میں گھس کر انہیں اسلام سے برگشتہ کر سکیں گے اور یوں عیسائیوں کی تعداد میں اضافہ کا سبب بنیں گے، اسمتھ کو اس بات پر انشراح صدر ہے کہ یہ دور بڑے پیمانہ پر اجتماعی تبدیلیٔ مذہب کا امکان نہیں رکھتا، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالمی سطح پر انسانی معاشرہ اتنا کاسمولٹین ہوتا جارہا ہے کہ اب ایک عیسائی یا ایک یہودی یا ایک لاادریا (Agnostic) خود اپنے گھر میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ اس کا پڑوسی ایک ذہین، باعمل، متقی، پرہیزگار، بدھشٹ ہو یا ہندو ہو یا مسلمان ہو، اب ان سب کو اگر ایک ساتھ رہنا ہے تو انہیں ایک دوسرے کے مذہب سے بھی پوری واقفیت رکھنی چاہئے، یہاں ایک مسئلہ اور چھیڑنے کو جی چاہتا ہے، اکثر لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر مستشرقین اپنے اس دعویٰ میں صادق ہیں کہ وہ اسلام کا مطالعہ خلوص نیت کے ساتھ کرتے ہیں تو پھر وہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے، یہ سوال خاصا اہم ہے اور چند لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا، ممکن ہے کہ کسی دوسرے پرچے میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہو لیکن جہاں تک اسمتھ کا سوال ہے، ان سے اگر خود ان ہی کے بارے میں یہ بات پوچھی جائے تو ممکن ہے وہ پلٹ کر جواب دیں کہ کیوں آخر میں مسلمان کیوں ہو جاؤں، جب میں خود ایمان کی دولت سے سرفراز ہوں اور عیسائی ہوتے ہوئے مجھے قلب کا اطمینان حاصل ہے تو پھر میں اپنا مذہب کیوں

چھوڑوں، شکریہ، لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ۔

اس مقالہ کے ختم ہونے کے بعد کچھ سوالات کیے گئے،

مولانا تقی الدین ندوی: سوال کرنا ہے، پروفیسر اسمتھ کے بارے میں جناب مشیر صاحب نے جو تحقیقات پیش کی ہیں، خاص طور سے الاسلام اور الایمان کے بارے میں، میرا خیال ہے کہ یہاں ال کو اسمتھ صاحب سمجھے ہی نہیں، ال یہاں تخصیص کے لیے ہے، الاسلام سے یہاں خاص اسلام مراد ہے اور الایمان سے خاص ایمان مراد ہے، یہ وہ اصطلاح ہے جسے قرآن نے استعمال کیا ہے اور جس کے بارے میں کہا ہے کہ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ اور یہ اسلام اور یہ ایمان جسے اسمتھ یہ کہتا ہے کہ پہلی صدیوں میں کچھ اور سمجھا جاتا رہا اور بعد کی صدیوں میں کچھ اور درآں حالے کہ قرآن خود کہتا ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا، اسلام مکمل اور جامع تو نازل ہی ہوا، یہ جس طرح پہلی صدیوں میں سمجھا جاتا رہا، بعد کی صدیوں میں بھی سمجھا جاتا رہا اور طبری کی ایک عبارت نقل کر کے یہ کہنا کہ شروع کی صدیوں میں مسلمانوں کو فی امرہ ونہیہ میں اختلاف نہیں ہوا تو اس سے مراد اوامر خدا کی پابندی ان حدود میں ہے جن کو خدا اور پیغمبر اسلام نے متعین کیا ہے، ہر شخص کی ایک اصطلاح ہوتی ہے، قرآن کی ایک اصطلاح ہے اور اسی اصطلاح کے مطابق ایمان واسلام کو اسمتھ صاحب کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی، لیکن اسمتھ نے ایک طرف تو یہ کہا کہ ہم ایمان کے لغوی اور اصطلاحی معنی مراد لے رہے ہیں، کون سے اصطلاحی معنی اور کون سی اصطلاح؟ اگر وہ اس اصطلاح کو مراد لیتے ہیں جو قرآن نے مراد لی ہے تو پھر کوئی اختلاف ہی نہیں، لیکن وہ اس کو لغوی معنی میں اطاعت خداوندی سے مراد لے رہے ہیں تو یہ حقائق کے بھی خلاف ہے اور اصطلاحات کے بھی خلاف، میرے خیال میں ان کو غلط فہمی ال سے ہوئی ہے، ال تخصیص کے لیے ہے، مخصوص اسلام اور مخصوص ایمان مراد ہے، یعنی وہ اسلام جو قرآن نے پیش کیا ہے نہ کہ وہ اسلام جو ہر شخص پیش کرے۔

مشیر الحق صاحب: جو بات مولانا نے فرمائی، وہ تو میں خود ہی کہہ چکا ہوں، مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں اور اسمتھ کے نقطۂ نظر میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، اب یہ بات کہ ال کا جو فرق ہے اسے اسمتھ سمجھے

بھی ہیں کہ نہیں، یہ مجھ پر بھی بڑا ظلم ہے اور اسمتھ پر ہوگا، مقالہ پیش کرنے کے لیے تو ۵، ۷ منٹ دیا جائے، اسے بھی کاٹ چھانٹ دیا جائے، اس مقالہ کا مقصد اسمتھ کے خیالات کو پیش کرنا تھا، ظاہر ہے کہ ہم ان کی ساری باتوں کو صحیح نہیں سمجھتے، جہاں اختلاف تھا وہ پیش کر دیا گیا، صرف ایک کنکر پھینکنا ہے، تالاب میں کہ ممکن ہے کسی خدا کے بندے کو یہ شوق پیدا ہو جائے کہ بھئی ان کو پورا پڑھیں۔

تقی الدین صاحب: تو آپ نے پورا پڑھ لیا ہوتا، اخیر تک تا کہ بات واضح ہو جاتی۔

مشیر الحق صاحب: میں نے پڑھ لیا لیکن یہاں پیش کرنے کے لیے اتنے چھوٹے سے مقالہ کو تو پورا وقت نہیں دیا گیا، پھر ایک نئے مقالہ کی کہاں گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اسمتھ ان چیزوں کو سمجھتے نہیں، جس طرح مستشرقین کی تحریروں پر گفتگو ہوتی رہی ہے، اس میں یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ ہماری چیزوں کو کس طرح پیش کرتے ہیں، ہم مستشرقین کی صف میں اسمتھ کو رکھتے ہی نہیں۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار : ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ نے سوال کیا کہ اسلام ہر دور میں رہا ہے اور خدا کا پسندیدہ دین ہے، اس کی اصلاح شدہ اور آخری شکل محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تو اگر اس کو محمدیت یا محمڈن ازم اور اس کے پیروؤں کو محمدی یا محمڈن کہیں تو کیا حرج ہے؟

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب: مولانا تقی الدین صاحب کا ارشاد اپنی جگہ پر درست ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں لہجہ کی اتنی کرختگی نہ ہونی چاہئے، جو مولانا نے اپنے جذبۂ اخلاص کی بنیاد ہی پر اختیار کیا ہوگا، مستشرقین کے مسئلہ کے بارے میں ہمیں اس لحاظ سے بہت تنقیحات اور چھان بین کرنی پڑے گی کہ مستشرقین کے جو نظریات ہیں، خود ہم مسلمانوں پر ان کے کیا اثرات پڑ رہے ہیں، ہمارا جو قدیم طبقہ ہے وہ کسی اور ڈھنگ سے سوچتا ہے اور جو جدید طبقہ ہے وہ اور طریقہ سے سوچتا ہے، بہت سے ایسے مسائل ہیں جن میں خود ہمارے یہاں اختلافات بہت ہیں، چاہے ہم ان سے اتفاق کریں یا نہ کریں، لیکن بہ ہر حال اختلاف ہے، ان اختلافات میں کسی نے اگر کوئی پہلو اختیار کر لیا ہے، جو ہمارے یہاں مشہور و معروف نہیں ہیں، تو ہمیں اس پر زیادہ ناراض نہ ہونا چاہئے، اس لیے ہمارا خیال ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تشریحات کے بعد مسئلہ صاف ہو جائے گا، یہ بات بھی ہے کہ مقالات کا جب ہجوم ہوتا ہے تو وقت کا سوال پیدا ہوتا ہے، مقالہ نگار کو تکلیف ہوتی ہے کہ وہ بہت سے اہم پوائنٹ کو ظاہر نہیں

کر پاتا، اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ مقالات کے پہلوانوں کی دنیا الگ ہی ہے، یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ کسی پہلوان کو زیادہ وقت یا کم وقت ملا، بس ایک انداز ہے اسی لحاظ سے غور کرنا چاہئے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی : جناب عابد رضا بیدارؔ ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ نے یہ سوال کیا کہ اسلام جو ہر دور میں رہا ہے اور خدا کا پسندیدہ دین ہے، اس کی اصلاح شدہ اور آخری شکل محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تو اگر اس کو محمدیت اور اس کے پیرووں کو محمدی یا انگریزی میں محمڈن کہیں تو کیا حرج ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا نے اس دین کا نام اسلام رکھا ہے جو ہر پیغمبر لے کر آیا ہے، حضرت ابراہیم کے بعد کئی اولوالعزم پیغمبر حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور پھر آنحضرت ﷺ آئے، کہیں مسلمانوں کو خطاب کر کے قرآن نے کہا ہے کہ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ، وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (حج:۸۸) تو معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اس دین کو اسلام کا نام دیا تھا اور ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمان موجود نہیں تھے، ابراہیمؑ کے بعد جتنے پیغمبر آئے اور جو امتیں ہوئی ہیں وہ پیغمبر اسلام کے داعی تھے اور امتیں اسلام کی متبع تھیں، لیکن ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اسی اسلام کو جو ہمیشہ سے آتا رہا ہے، کی تحریفات کو دور کر کے اس کو اپنی شکل میں پیش کیا ہے اور اب وہی اسلام معتبر ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا تھا اور جو آپؐ لے کر آئے اور اس میں کہ اب اسلام کو محمدیت کہا جائے اور امت اسلامیہ محمدیون کہا جائے، میں اس میں فرق سمجھتا ہوں، اس میں یورپ کی ایک سازش تھی کہ مسلمانوں کو محمڈن کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا اور یہ سازش بڑی ذہانت پر مبنی تھی، اس کی تائید مشیر الحق صاحب کے مقالہ سے بھی ہوتی ہے اور ہندوستان کے مسلمان کسی وجہ سے بھی جس میں بدنیتی کا شبہ میں نہیں کرتا، اس میں محبت رسول ﷺ کا بھی دخل ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اداروں کا نام شروع شروع میں محمڈن اورینٹل کالج، محمڈن عربک کالج یا ایک زمانہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس رکھا تھا اور اب محمڈن لا کے نام سے ہمارا اسلامی قانون ہے، وہ اس وقت تک رائج ہے، لیکن بعد میں مسلمانوں کو خود اس کا احساس ہوا اور کئی اداروں اور تحریکوں کا نام بدلا گیا، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پڑ گیا اور ہم مسلمانوں کو اس پر اصرار کرنا چاہئے کہ اسلام

اس پر اصرار کریں گے کہ اسلام کو اسلام کہا جائے اور مسلمانوں اور اس کے پیروؤں کو امت مسلمہ کا نام دیا جائے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ہم کہیں کہ وہ اسلام جسے صحیح شکل میں رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے اور جس کا کلمہ جامعہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، لیکن ہم اسلام کو اسلام ہی کہیں گے اور خدا کا شکر ہے جیسا کہ مشیر الحق صاحب نے بتلایا کہ اسمتھ صاحب کو بھی اس کا احساس ہے کہ اسلام کو اسلام ہی کہنا چاہئے، محمڈن ازم نہیں کہنا چاہئے، باقی میں اخیر میں یہ عرض کروں گا کہ شروع سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اس علمی مذاکرہ کا وہ نقطہ جس پر تقریباً ابھی تک سب کا اتفاق رہا ہے کہ مستشرقین اپنی ساری روشن خیالیوں اور اپنے سارے وسعت مطالعہ اور وسعت ذہنی کے باوجود بہ ہر حال وہ یہودی اور عیسائی ہیں اور مشیر صاحب نے بھی اس کا اظہار کیا ہے، ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ یہودی اور عیسائی ہیں اور جیسا کہ پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی نے کہا کہ وہ دعویٰ تو کرتے ہیں معروضی نقطۂ نظر کا، لیکن کانٹ کی آخری تحقیقات سے دو سو برس پہلے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے یہ بات واضح کردی ہے کہ عقل مجرد کا وجود نہیں ہے، میں اس سے آگے بڑھ کر کہوں گا کہ علم مجرد کا بھی وجود نہیں، تحقیق مجرد کا بھی وجود نہیں ہے، اس میں قدیم عقائد جو راسخ ہو چکے ہیں، رگ وپے میں سرایت کر چکے ہیں، خاندانی روایات تک، ماحول کے اثرات، مسلمات، بے اصل مسلمات کا سایہ اس طرح پڑتا ہے کہ اس میں مدعی کو یا داعی کو یا محقق کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ اس نے جو نظریہ علم مجرد اور تحقیق خالص کے طور پر پیش کیا ہے، وہ تحقیق خالص ہے یا ممزوج ہے یا ایک آمیزہ ہے، پرانے اثرات کا، مستشرقین کی تحقیقات نے ایک اور مہر تصدیق ثبت کردی ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے محض اپنے سلامت قلب اور تائید الٰہی سے جو بات آج سے سوا تین سو برس پہلے کہی تھی کہ نہ تو عقل خالص کا وجود ہے نہ کشف خالص کا، سب متاثر ہوتے ہیں، تحت الشعور سے اور تحت الشعور کے اندر جو مکتوبات ہیں، جو مخزونات ہیں، جو پہلے سے خزانہ ہے، اس سے متعلق ہوتے ہیں، میں ان الفاظ کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں، اس کے بعد مذکورۂ بالا خیالات کو مولانا نے عربی زبان میں بھی پیش کیا، (دوسری نشست یہیں ختم ہوئی)

سمینار کی تیسری نشست جناب سید حامد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی صدارت میں شروع ہوئی اور اس کی کاروائی کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری اس خاک سار نے لی، یہ نشست

صرف پاکستان کے مقالہ نگاروں کے لیے مخصوص کردی گئی تھی۔

خاک سار نے عرض کیا کہ یہ نشست صرف پاکستانی وفد کے مقالہ نگاروں کے لیے مخصوص کردی گئی ہے، ہم پاکستانی وفد کے اراکین کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے دور دراز سفر کی تکلیفیں، برداشت کر کے اس سیمینار میں شرکت کی اور ہم کو اپنے لطف و کرم سے نوازا، پاکستان سے جو حضرات تشریف لائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت جناب حکیم محمد سعید دہلوی کی ہے، جو کسی تعارف کے محتاج نہیں، ان کا نام اس وقت پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، البتہ بعض حیثیتوں سے میں ان کا ذاتی طور پر بے حد ممنون ہوں کہ ان کے ایسے احسانات ہیں جو میرے دل کے اندر رہ کر میری قبر میں ساتھ ہی جائیں گے، ان کے ساتھ کراچی سے ڈاکٹر فریدالدین بقائی، حکیم نعیم الدین زبیری صاحب بھی آئے ہیں، مفتی سیاح الدین کاکاخیل رکن اسلامی نظریاتی کونسل بھی تشریف لائے ہیں، لیکن وفد کی صورت میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد کے معززین آئے ہوئے ہیں، ان کے سربراہ ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتا ہیں، جو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے بڑے محبوب ڈائرکٹر ہیں، ان کے جلو میں جناب عبدالقدوس ہاشمی ہیں جو اسی انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر ہیں، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی بھی ہیں جو اسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ فکر و نظر کے بڑے قابل اڈیٹر ہیں اور جناب محمود احمد غازی ریڈر، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ڈاکٹر محمد طفیل اور اسی انسٹی ٹیوٹ کے لائبریرین ڈاکٹر احمد خان بھی ہیں، ان حضرات کی تشریف آوری سے مجھ کو ذاتی طور پر انتہائی خوشی ہے اور میں دارالمصنفین کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی فرمایا کرتے تھے کہ جو دارالمصنفین کا مہمان بن کر یہاں آتا ہے کہ اس کو میں اخلاص کا پیکر سمجھتا ہوں، اس لیے کہ اس دور افتادہ مقام تک سفر کرنا آسان نہیں ہوتا، دلی اور لکھنؤ پہنچنا تو آسان ہوتا ہے اور وہاں پہنچ کر کسی سے ملنے جانے میں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اپنا ذاتی کام بھی کرلیا جاتا ہے اور کسی سے مل کر یہ احسان جتادینے میں آسانی ہوتی ہے کہ صرف ان سے ملنے کی خاطر یہ سفر کیا ہے، لیکن دارالمصنفین میں وہی لوگ آتے ہیں جو صرف دارالمصنفین دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں، کیوں کہ یہاں کسی اور تفریح کا سامان نہیں ہے، اس لیے

پاکستان کے لوگوں نے سفر کی جو صعوبتیں برداشت کر کے یہاں آنے کی زحمت گوارا کی، ان کو دارالمصنفین کے لوگ اخلاص کا پیکر سمجھ رہے ہیں، مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جب میری طرف سے ڈاکٹر ہالی پوتا صاحب کو دعوت نامہ پہنچا تو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا پورا اسٹاف یہاں آنے کے لیے خواہش منداور تیار ہوا، جب اس کی خبر انسٹی ٹیوٹ کے صدر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد کو ہوئی تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو تو پھر بند کرنا پڑے گا، یہ کسی لحاظ سے مناسب نہیں، میرا دعوت نامہ ان کی خدمت میں بھی پہنچا تھا، لیکن انہوں نے ایک خط میں اپنی مشغولیتوں اور مجبوریوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ ان کی زندگی کی بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ دارالمصنفین کو دیکھیں، اس موقع پر حاضر ہوتا تو یہ آرزو پوری ہو جاتی، معلوم نہیں آیندہ زندگی میں یہ آرزو پوری ہو سکے بھی یا نہیں، سمینار کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار صدق دل سے کیا ہے۔

اب میں سب سے پہلے جناب ڈاکٹر ہالی پوتا صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ یہاں تشریف لا کر اپنے تاثرات کا اظہار کریں، اس موقع کے لیے جو باتیں ان کے ذہن میں آئی ہیں، ان سے ہم لوگوں کو محظوظ کر کے شکر گزار کریں، اس خاک سار کو دارالمصنفین کے کاموں کے سلسلہ میں اسلام آباد میں بہت دنوں تک قیام کرنا پڑا، مولانا کوثر نیازی وزیر امور مذہبی حکومت پاکستان کے ایما پر اسلام آباد کلب میں جناب ہالی پوتا کی نگرانی میں اس خاک سار کی جو پذیرائی کی گئی، اس کی یادوں کی شمع اب تک روشن ہے، اس کی ایک شان دار افطار پارٹی میں پاکستان ریڈیو والوں اور اخبار نویسوں نے دارالمصنفین سے جو دل چسپی ظاہر کی، اس کے لیے یہ خاک ساران کا بہت ممنون ہوا، اسلام آباد میں میرا زیادہ تر وقت انسٹی ٹیوٹ ہی میں گزرا، جہاں پہنچ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دارالمصنفین میں ہی بیٹھا ہوں، ڈاکٹر ہالی پوتا صاحب نے ہر قسم کی مادی، علمی اور اجازت دیجیے تو یہ بھی کہوں کہ روحانی نوازشوں سے نوازا، ان کے متعلق بغیر کسی شک وشبہ کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان کے اچھے لوگوں کی ایک فہرست تیار کی جائے تو اس میں ان کا نام نامی ضرور ہوگا، کیوں کہ میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کے دل کو چیر کر دیکھا جائے تو اس میں حسین اور خوش بودار گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوئی نظر آئیں گی۔

جناب عبدالواحد ہالی پوتا: جناب صدر! میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا بہت شکر گزار ہوں

کہ انہوں نے میرے متعلق یہ سب کچھ کہا ہے، یہ خود ان کے ذاتی خلق کی دلیل ہے، وہ صرف اچھی چیزوں کے دیکھنے کے عادی ہوں گئے ہیں، ہم لوگوں کو دارالمصنفین سے بہت ہی گہرا تعلق ہے، کیوں کہ اس مرکز سے جو انوار ظاہر ہوئے ہیں، ان کو کوئی کیوں کر نظر انداز کرسکتا ہے، میں اپنی طالب علمی کے زمانہ سے دل میں یہ خواہش رکھتا تھا کہ اس مرکز کی زیارت کروں اور جب جناب سید صباح الدین کا خط آیا تو میرے لیے یہ دعوت نامہ نہ تھا، گویا یہ حکم تھا، اس کی تعمیل میرے لیے ضروری ہوگئی، اسی تعمیل کی خاطر میں یہاں حاضر ہوگیا ہوں، آپ اگر اجازت دیں تو میں اپنے خیالات کا اظہار انگریزی زبان میں کروں۔

اس کے بعد وہ انگریزی میں بولے، جس کا خلاصہ یہ ہے: میں کچھ بول کر آپ لوگوں کے معلومات میں اضافہ نہ کرسکوں گا، لیکن مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں کچھ بولوں، تو کچھ باتیں سماعت کرنے کی تکلیف گوارا کریں، اس سے مجھ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوجائے گا کہ اس عظیم اور مقدس تقریب میں میری بھی شرکت ہوگئی، میں زیادہ تر اپنے ذاتی تجربات کو بیان کرنا چاہتا ہوں، جو مجھ کو مستشرقین کے سلسلہ میں حاصل ہوئے ہیں، میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میں ۱۹۳۸ء سے ان مستشرقین کا مطالعہ کررہا ہوں، ان کی طرف میری توجہ ڈاکٹر داؤد پوتا نے دلائی، جو اسماعیل کالج جوگیشوری بمبئی میں تھے، میں نے اسلامی علوم مدرسہ کی تعلیم میں بھی حاصل کیے ہیں، میں جب ہائی اسکول میں تھا تو میرے ساتھ ہندو طلبہ بھی تھے اور ہندو اساتذہ بھی، جن سے اسلام کے متعلق باتیں ہوتی رہتی تھیں لیکن جب مجھ کو مولانا عبید اللہ سندھی کی صحبت کا شرف حاصل ہوا تو انہوں نے مجھ کو شاہ ولی اللہؒ کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی اور پھر ان ہی کی خواہش کے مطابق حجۃ اللہ البالغہ پڑھنا شروع کیا اور جب میں انگلستان گیا تو پروفیسر نکلسن اور پروفیسر میکڈانلڈ سے ملنے کی عزت حاصل ہوتی رہی، ان کی کتابیں اور تحریریں پڑھ کر ان سے بہت سی معلومات ضرور حاصل کرتا لیکن یہ بنیادی بات سمجھ کر ایسے لوگوں کی تحریریں پڑھنی چاہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں کو ان کے مذہب اور مذہبی عقائد کو سمجھانے کے لیے کتابیں نہیں لکھا کرتے بلکہ وہ اپنے عیسائی مبلغین کے لیے لکھا کرتے ہیں وہ ہمارے مذہب، ہماری تاریخ کے کمزور پہلوؤں کو اس لیے پیش کرتے ہیں کہ عیسائی مبلغین ان ہی کو اچھال کر اسلام کے خلاف

زہر چکانی کریں اوران کو اپنے مذہب کی تبلیغ میں مدد حاصل ہو، وہ بعض ایسی باتیں بھی لکھ جاتے ہیں جن کا تعلق نہ ہمارے مذہب سے ہے نہ ہمارے مذہبی عقائد سے لیکن وہ اپنے عیسائی مبلغین کے لیے کچھ مواد فراہم کر دیتے ہیں اور یہ مبلغین ان کو روشن ضمیر اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کی یقینیات بنا کر لوگوں کو گم راہ کرتے ہیں، مجھ کو پروفیسر گبؔ کی شاگردی کی بھی عزت حاصل ہوئی، وہ مجھ پر بے حد مہربان تھے اور مجھ کو زیادہ سے زیادہ وقت دیا کرتے، انہوں نے مجھ کو وہاں کا اہم وظیفہ دلایا تا کہ میں رہنے سہنے پڑھنے لکھنے، حتیٰ کہ اپنے مسودات ٹائپ کرانے میں زیادہ سے زیادہ سہولت حاصل کر سکوں، ان کو شاہ ولی اللہ سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی اور ان کی نگرانی میں میں نے اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی مقالہ ختم کر لیا، جس کی تعریف پروفیسر گبؔ نے کی لیکن اس کو دو بڑے مستشرقین نے منظور کرنا پسند نہیں کیا، ان میں ایک مستشرق پاکستان بھی آئے اور ان کو یہاں اعزازی ڈگری دی گئی، وہ اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر شاہ ولی اللہ کو پسند نہیں کرتے تھے، مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ یہ مقالہ اگر منظور بھی کیا گیا تو اس کو یورپ میں نہیں چھپنا چاہیے، اس سے ان مستشرقین کے مذہبی اور ذہنی تعصب کا بھی اظہار ہوتا ہے، پروفیسر گبؔ نے محمڈن ازم پر کتاب لکھی اور جب میں نے ان سے اس کتاب پر گفتگو کی تو انہوں نے اس کا اعتراف کیا کہ محمڈن ازم کی اصطلاح صحیح نہیں ہے لیکن یہ کتاب مارگولیتھ کی محمڈن ازم کی جگہ پر لکھی گئی ہے، اس لیے اس کا نام بھی نہیں بدلا گیا، اس میں مارگولیتھ کی طرح چونکا دینے والی باتیں نہیں ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر دل کو وہ صدمہ نہیں پہنچتا جو مارگولیتھ کی کتاب کے مطالعہ سے پہنچتا ہے، گو ان کی بعض باتوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انہوں نے اور پادری اسکالرس کی طرح یہ کتاب نہیں لکھی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ مسلمان نہیں تھے، میں ایک مستشرق بینٹ سے بھی ملا جن کو صوفی ازم سے بڑی دلچسپی تھی اور صوفی ازم پر نصاب میں کچھ کتابیں بھی رکھوائیں جن میں کشف المحجوب بھی تھی، میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے کو مسلمان تو نہیں کہتے لیکن وہ مسلمانوں کی روایت کا احترام کرتے ہیں، یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مستشرقین میں کچھ اسکالر ایسے بھی ہوتے ہیں جو یا تو خود پادری ہوتے ہیں یا خاندانی حیثیت سے پادری بنے رہتے ہیں، ہمارے مقالہ کو جس مستشرق نے پسند نہیں کیا، وہ پادری ہی تھا، ان پادریوں سے ہم کو کسی قسم کی ہم دردی کی توقع کرنا

صحیح نہیں، ہم کو خود اپنے لٹریچر پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور ہم خود اپنے یہاں ایسے قابل قدر اور وزنی لٹریچر پیدا کرلیں کہ ہمارا اور ہمارے نوجوانوں کا ذہن ان مستشرقین کی کتابوں سے متاثر نہ ہو، لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ماڈرن اسلام پر کوئی کتاب لکھی گئی، میں کہتا ہوں کہ یہ ماڈرن اسلام کیا ہے، اگر خرافات کا نام ماڈرن اسلام ہے تو پھر ایسی چیزوں پر کوئی کتاب لکھنے کی ضرورت نہیں، مسلمان جو کچھ آج کل کرتے ہیں یا کہتے ہیں، اس کو اسلام سمجھنا اسی طرح صحیح نہیں ہوگا جس طرح نازی ازم یا اسی طرح کے اورازم کو کوئی کرسچنٹی یا عیسائیت کہے۔

اس تقریر کے بعد خاکسار نے مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی خدمت میں عرض کیا، وہ تشریف لائیں اور اپنے خیالات کا اظہار کریں، مولانا عبدالقدوس صاحب کے بارے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر فقہی، مذہبی، تاریخی، سیاسی اور دنیا بھر کے معلومات کو نچوڑ کر ایک پیکر بنایا جائے تو وہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی ذات ہوگی، انہوں نے اسلام اور مستشرقین پر ایک کتاب لکھی ہے، جس کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں، وہ اب تشریف لا رہے ہیں۔

مولانا عبدالقدوس ہاشمی : اعوذ باللہ، بسم اللہ الحمد للہ الذی لاالٰہ الا وحدہ، والصلوٰۃ والسلام علی النبی الذی لا نبی بعدہ، حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، ایک لطیفہ سنا کر چلا جاؤں گا، میں مقالہ وقالہ لکھ کر نہیں لایا ہوں، مقالہ میرا کئی زبانوں میں شائع ہو چکا اور کئی رسالوں میں بھی اور بڑی گالیاں کھائی ہیں، مغرب والوں کی، پروفیسر اسمتھ کا ذکر ہو رہا تھا، میں نے ان کو بڑا قابل، بڑا معقول اور بہت عمدہ آدمی پایا، میری ان سے بہت سی ملاقاتیں رہیں، وہ کہنے لگے کہ اسلام ہمیشہ سے تھا؟ میں نے کہا بالکل، وہ تھا کہنے لگے کہ اسلام کے لفظی معنی ہیں اطاعت کے لیے سر جھکا دینا، میں نے کہا بالکل ٹھیک معنی، کس کی اساعت کے لیے، انہوں نے کہا: اللہ کی اطاعت کے لیے، میں نے کہا اور یہ بتاؤ کہ اس کا علم کیسے ہوگا؟ ٹیلیفون پر تو اللہ میاں بولتے نہیں، انہیں ٹیلی گرام دو تو جواب نہیں دیں گے، خط لکھو تو جواب نہیں دیں گے تو یہ معلوم کیسے ہوگا کہ ان کی اطاعت کیسے ہو؟ میں نے کہا سنو! ایک لڑکا تھا وہ کہتا تھا کہ یہ آدمی جو کھڑا ہے میرا ماموں ہے، میں نے کہا کہ واقعی تم کو معلوم ہے کہ یہ تمہارا ماموں ہے؟ تم اپنی ماں کو سچی

سمجھتے ہو کہ یہ اس کا بھائی ہے؟ کہنے لگا نہیں، ماں کی صداقت پر مجھے شبہ ہے، میں نے کہا تو ماموں کیسے ہوئے؟ یہ بیان کر کے میں نے کہا اچھا بھائی! محمد رسول للہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن مجید کو خدا کی کتاب کہتے ہیں، میں نے کہا اچھا بھائی وہ جو خدا کی مرضی تھی، وہ مرضی معلوم کیسے کریں گے اور خدا کی اطاعت کیسے کریں گے؟ کوئی ذریعہ نہیں، اس لیے سیدھی بات کا اقرار کیجیے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا یقین ہے تو سمجھ میں آئے گا کہ یہ کیا ہے، ورنہ اس کے علاوہ یہ بکواس ہوگی، سرے سے یہ عقل کی بات ہی نہیں کہ جب خدا کی مرضی ہی نہیں معلوم تو خدا کی رضا کی کوشش کیسے ہوگی، کہنے لگے کہ یہ تو سب کہتے ہیں، میں نے کہا: اچھا عیسیٰ مسیح کی زبان سے نکلا ہوا کوئی ایک ٹکڑا سنا دو جس میں وہ خدا کی مرضی بیان کرتے ہوں، وہ کہنے لگے کہ یہ تو نہیں ہے، میں نے کہا پھر کس افسانہ کی بات کرتے ہو، اس اسلام کی جو حضرت آدمؑ سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک تھا، اس کی تعبیر صرف ایک ہی کر سکتے ہیں کہ جو رسول اللہ ﷺ نے کر کے بتلایا اور کہہ کر بتلایا، حضرت موسیٰؑ نے بھی یہی بتایا ہوگا، حضرت ابراہیمؑ نے بھی یہی بتایا ہوگا، حضرت نوحؑ نے بھی یہی بتایا ہوگا لیکن بابا ہیں کہاں، ان کے الفاظ، تم کہتے ہو کہ ترجمے کے ترجمے کا ترجمہ اور اس کے ترجمہ کرنے والے کا نام نہیں بتلاتے ہو، اس لیے یہ مہمل سی بات ہے، ایک لطیفہ تو یہ سنا دیا آپ کو کہ اماں کو تو سچا نہیں کہیں گے لیکن ابا کو ابا کہیں گے، اچھا کیسے کہیں گے، ایسا الجھا ہوا دماغ ہے، معمولی مسائل میں اور معلوم ہوگا بات کہہ دی بڑی عالمانہ، حالاں کہ انتہائی مہمل بات ہے، خبر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے، جب تک مخبر کی صداقت پر ایمان نہ ہو، خبر ہمیشہ محل صدق و کذب ہے، جب تک کہ مخبر کو صادق نہ مان لیا جائے، دنیا کا سارا انٹرنیشنل لا ختم ہو جائے گا، دنیا کا نظام ختم ہو جائے گا، اگر اس قسم کی کوئی ترتیب نہ ہو تو رسول اللہ ﷺ مخبر ہیں اور ان کے علاوہ کسی اور مخبر کے الفاظ ہمارے پاس نہیں، پھر اس کے بعد اللہ کی اطاعت کے اور کون سے طریقے ہیں، اتنا غلط منطقی دعویٰ ہے، یہ کہ اس کا جواب نہیں ہوسکتا، جب میں نے یہ سمجھایا تو خیر ادھر ادھر کی بات کرنے لگے، بس قضیہ ختم، ایسے ہی ایک اور لطیفہ سنایا اور اب تین منٹ میں دوسرا لطیفہ سنا دوں، جب میں چین گیا تو وہاں ڈاکٹر آف نیچرل گائڈنس بتلایا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوگا، سب غلط ہے، یہ ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے، انہوں نے مجھ سے وقت لیا کہ ملنے آرہا ہوں، میں نے کہا ضرور آیئے، آئے، انہوں نے

ایک گھنٹہ تقریر کی اور کہنے لگے کہ کوئی بات ہے پوچھنے کی؟ میں نے کہا پوچھنے کی کیا بات رہی، زندگی بھر پریشان رہے کہ اس کے بعد جزا ہوگی، سزا ہوگی، آج تم نے چھٹکارا دیا، اب جو جی چاہے سو کرو، شکریہ بھائی! اب کیا سوال کروں، انہوں نے کہا نہیں نہیں کچھ سوال کرو، میں نے کہا: اچھا بھائی تو صرف یہ بتلا دیجیے کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا ہے، اس کی خبر آپ کو کیسے ہوگئی؟ کہنے لگے کہ کیا سوال ہوا، میں نے کہا سامنے ایک درخت ہے اس کے پیچھے ایک مکان ہے، اس مکان میں ایک عورت بیٹھی ہے کہ نہیں بیٹھی ہے، جواب دے سکتے ہو؟ اگر اس کا جواب ایجابی دیتے ہو کہ ہاں ہے تو تمہیں اس کا علم ہونا چاہیے، سلبی دیتے ہو تو اس کا علم ہونا چاہیے، اگر میں تم سے پوچھوں کہ تم نے اس کو وہاں جا کر دیکھا؟ اور جواب میں تم کہہ دو کہ کبھی نہیں دیکھا، اچھا اگر کسی دیکھنے والے نے تم کو جواب دیا تب تم کیا کہہ سکو گے، کوئی دیکھنے والا ہی نہیں، اچھا اب تمہارے جواب کی قیمت کتنی قیمت رہ گئی، حساب لگا کر بتاؤ، تو صفر، سرے سے بے معنی ہو کر رہ گئی، سارا جواب تمہارا صفر ہو کر رہ جاتا ہے، اس لیے کہ تمہارے پاس علم ہی نہیں، اس لیے کہ نہ تم نے خود دیکھا، نہ کسی دیکھنے والے کو دیکھا، تو میں کہتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا، سوال جواب، اس کا تجربہ آپ کو کتنی بار ہوا، کتنی مرتبہ مر کر دیکھا؟ کہنے لگے کبھی نہیں، میں نے کہا کسی مرنے والے نے آ کے جواب دیا؟ کہنے لگے وہ بھی نہیں، تو میں نے کہا اچھا مکمل جہالت پر یقین رکھتے ہو؟ کیا قیمت ہوگی، مکمل جہالت بے معنی، سرے سے غیر منطقی بات، میں نے کہا تمہارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، تو غصہ میں کہنے لگا تو تمہارے پاس کیا ذریعہ ہے، میرے پاس باون برس کا بڈھا نہایت نیک آدمی چلا آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں نے معراج میں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، چشم دید شاہد ہوں، اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا وہ جھوٹا ہے یا سچا، میں نے تلاش کرنا شروع کیا تو ثویبہ کو پکڑا، حلیمہ کو پکڑا، جس نے پہلا قطرہ دودھ پلایا تھا، اس بوڑھے آدمی کو، اس نے کہا کہ نہیں، کبھی جھوٹ نہیں بولا، حلیمہ سے پوچھا کہ تیری گود میں تتلا کر بولنا سیکھا تھا، اس نے کہا کہ کبھی جھوٹ نہیں بولا، عقبہ بن معیط پھر ابولہب سے پوچھا، ابوجہل سے پوچھا اور بی بی سودہ بنت زمعہ سب نے کہا کہ نہیں صاحب یہ جھوٹ نہیں بولا، تو میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں کہ آخر یہ شخص اپنے فائدہ کے لیے جھوٹ نہیں بولتا ہے، اپنی مخالفت کے لیے جھوٹ کاہے کو بولے گا، تب ہم نے اس کو سچا تسلیم کیا، اس کی بات مان لی، ہم بھلے

آدمی ہیں، تم بے وقوف ہو، میں نے کہا سیدھی بات یہ ہے، میں ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچا، اس نے میری نبض پکڑی اور کہا، تم کو مزمن پیچش ہے اور اس نے شیشی نکال کر دی، اس کے اوپر لکھا ہوا تھا، پوائزن اور اس شیشی سے نکال کر ایک ٹکیہ دی کہ اس کو کھا جاؤ، تب میں نے نہ ڈاکٹر کی رجسٹریشن دیکھی نہ سرٹیفکٹ دیکھا، بس دوا کھا گیا، انہوں نے کہاں، ہاں یہی ہوتا ہے، میں نے کہا میرے دوست! تم نے ڈاکٹر کا بورڈ دیکھ کر اپنی جان اس کے حوالہ کر دی تو بہت عقلمند ہوا اور ہم نے باون برس ٹھونک بجا کر اس کو دیکھا اور اپنا ایمان اس کے حوالہ کر دیا تو ہم بے وقوف ہیں، دیکھیے اصل بات یہ ہے، ان لوگوں کے سوچنے کا انداز علمی طور سے غلط ہے، ان کا انداز فکر ہی اتنا غلط ہے کہ وہ غلط نتائج تک پہنچتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم کو یہ نظر آتا ہے کہ دنیا میں جتنی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں، وہ کسی ایک رخ کو متاثر کرتی ہیں، کوئی اقتصادی ہوتی ہے، کوئی سیاسی ہوتی ہے، مگر ایک تحریک ایسی پیدا ہوئی جس نے انسانی زندگی کے ہر رخ کو متاثر کیا، نکاح وطلاق کے قواعد بدل دیے، کھانے پینے کے اصول بدل دیے، سوچنے کے طرز بدل دیے، یہ بدل دیے، وہ بدل دیے، ایسی عظیم الشان تحریک جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتی چلی گئی اور اس تحریک کو برپا کرنے والا وہ بے بس و بے کس انسان ہے جس کے پیچھے نہ کسی شہزادگی کی روایت ہے، نہ وہ کسی کالج کا سند یافتہ ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تحریک کامیاب ہوئی اور اتنی کامیاب ہوئی کہ اپنی زندگی ہی میں کمال تک پہنچتے دیکھا، نو لاکھ ستائیس ہزار چھ سو دو مربع میل پر اس کی حکومت قائم ہوگئی، دس برس کے اندر جو دیکھتا ہے گھبرا جاتا ہے، ایسا بے کس آدمی کہ طائف کے بازار میں ڈھیلے پھینک رہے ہوں لوگ اور کوئی ایک گلاس پانی تک دینے والا نہیں اور صرف دس برس کے عرصہ میں اتنے بڑے رقبہ پر اس کی حکومت قائم ہو جاتی ہے، ایسی کامیابی کس نے دیکھی، جب کہ تاریخ انسانی کی سات ہزار معلوم تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ دنیا میں کسی تحریک چلانے والے نے اپنی زندگی میں اس کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھا، یاد رکھیے کہ انسانی زندگی اتنی چھوٹی ہے کہ کوئی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوتی، کسی انسانی زندگی میں، ایک واقعہ ہے انسانی تاریخ میں صرف ایک واقعہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے تحریک چلائی اور اپنی زندگی میں کامیابی سے اس کو دیکھ لیا، جب ایسا واقعہ ان کی سمجھ میں آتا ہے، انگریز بے چارے پڑھنے والے کے تو پھر وہ طرح طرح کی باتیں نکالتا ہے، کچھ

جہالت سے کچھ اپنے تعصب سے، اس کو اتنی موٹی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو صاحبِ ایمان ہونے کی بنا پر رسول اللہ ﷺ پر ایمان کامل ہو گیا، یہ بات غیر مسلم کو سمجھ میں نہیں آتی، اصل سوال یہ ہے کہ کائنات میں کچھ مقدس صداقتیں ہیں، ان پر سب متفق ہیں کہ انسان کو ایسا ہونا چاہیے، جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، بددیانت نہیں ہونا چاہیے وغیرہ، یہ عالم گیر صداقت ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، اس میں کسی مذہب اور ملت کا بھی فرق نہیں ہے، بس صداقت والا آدمی دنیا سے گم ہو گیا تھا، انسان کو نظر نہیں آرہا تھا، رسول اللہ ﷺ کی جب بعثت ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ اچھا بھلا آدمی کسے کہتے ہیں، جب پہلی بار رسول اللہ ﷺ ایک بھلے آدمی نظر آگئے تو بھلے آدمی کا جو پیمانہ انسانیت نے آدمؑ سے لے کر اب تک قائم کر رکھا تھا اس پر ایک آدمی صحیح اترا، اس کے بعد سب کے سب جھک گئے، یہی تو ایک آئیڈیل تھا جس کو دنیا تلاش کر رہی تھی، تو مستشرقین کے مطالعہ کے لیے چاہیے کہ ہم ایک باقاعدہ لٹریچر پیش کریں، دنیا کو سمجھائیں کہ تم ایمان سے نہیں سمجھتے تو اتنا تو سمجھتے ہو کہ وہ آئیڈیل انسان تھا، بھلا آدمی جو تھا وہ دنیا میں سات ہزار برس سے نہیں مل رہا تھا، مختلف وقتوں میں پیغمبر کوشش کرتے رہے لیکن ایسا آئیڈیل نہیں مل رہا تھا اور جب رسول اللہ ﷺ کی ذات میں انسانیت نے ایسا آئیڈیل دیکھا تو یہ اتنی موٹی سی بات ہے، جو تم کو سمجھ میں نہیں آرہی، تم دیکھو کہ اس نو لاکھ مربع میل میں کتنا حصہ ملٹری آپریشن کے ذریعہ آیا، صرف چار ہزار مربع میل، تو مستشرقین صاحبان میں غلطی یہ ہے کہ یہ صحیح طور سے منطقی طور پر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اب رہی دشمنی تو مفتوح قوم کو فاتح قوم سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے، ہم کو چاہیے کہ ہم مربوط طریقہ سے صرف ان کی تردید میں نہیں، بلکہ صحیح ترین نقشہ پیش کریں، بھلا دیکھیے اس میں کیا منطقی مغالطہ ہے، سیدھی بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ایک مکمل انسان نظر آ گیا، نہ سمجھ میں آنے والی کیا بات ہے، میں نے پروفیسر اسمتھ سے کہا کہ بڑا غیر منطقی انداز ہے، آپ لوگوں کا منطقی انداز یہ ہے کہ معلومات جمع کرو، اس طرح کہ اصل حقیقت خود سامنے آجائے۔

مولانا علی میاں: حضرات قبل اس کے کہ دوسرے فاضل مقالہ نگار حضرات تشریف لائیں، میں نے عابد رضا بیدار صاحب کے ایک سوال کے جواب میں کچھ کہا تھا، اس سلسلہ میں کچھ وضاحت کر دوں کہ اہل علم کا مجمع ہے اور طالب علم کو اپنی غلطی یا کمزوری کا سب سے پہلے اعتراف کرنا چاہیے، میں نے دو

حدیثوں کا حوالہ دیا تھا، جس میں پہلی حدیث جو تھی کہ ما شاء الله وشئت، اس پر تو مجھ کو اعتماد ہے کہ اس کے الفاظ ہی ہیں لیکن مَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ، اس کے الفاظ پر مجھے اعتماد نہیں، شاید میرے حافظہ نے کوتاہی کی ہے اس لیے ان الفاظ کی صحت کی ذمہ داری نہیں لیتا اور یہ بھی وضاحت کر دوں کہ ایسے مظاہرے سے احتیاط جن سے شرک پیدا ہوتا ہو، اس کے علاوہ باقی جو کچھ ہے اس کی حقیقت یہی ہے، کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر اور سچی بات یہ ہے کہ ہمیں اس وقت جو دولت اللہ نے نصیب فرمائی ہے، اسلام اور ایمان کی شکل میں بلکہ انسانیت اور عقل سلیم کی شکل میں، وہ سب محمد رسول اللہ ﷺ کا صدقہ ہے، میں ان الفاظ کا اظہار ضروری سمجھتا تھا کہ کوئی اور غلط فہمی نہ ہو کہ صرف شرک سے بچنے کی ضرورت ہے ورنہ اس کے بعد تو واقعہ یہ ہے کہ علمی، عملی، واقعاتی اور تاریخی طور سے دنیا میں جو صداقتیں موجود ہیں اور جن کا حصہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو عطا فرمایا وہ سب محمد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہے اور انہی کی ذات اقدس پر اس کا انحصار ہے اور قیامت تک رہے گا اور اب نجات، ترقی درجات میں سے کسی چیز کا کوئی امکان آپؐ کی رسالت کے بغیر نہیں ہے۔

اس کے بعد خاکسار نے کہا، اب جناب ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اپنا مقالہ پڑھیں گے، مولانا حمید الدین فراہی پر ان کا ایک مبسوط مقالہ شائع ہونے والا ہے اور اس میں ہر قسم کی تحقیقات انہوں نے اکٹھا کی ہیں۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی: میرے مقالہ کا عنوان ہے ''مستشرقین اور اسلام'' یہ سمینار کے مرکزی موضوع اسلام اور مستشرقین سے ذرا ہٹ کر ہے، سمینار کے موضوع کا مطلب جہاں تک میں نے سمجھا ہے، یہ ہے کہ مستشرقین اسلام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اسلام کے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہے، جب کہ میں نے اپنے مقالہ میں اس مسئلہ سے بحث کی ہے کہ اسلام مستشرقین کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

سب سے پہلے میں موضوع میں شامل الفاظ کی مختصر لغوی اور معنوی تشریح پیش کرتا ہوں، اس سے آئندہ مباحث کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مستشرق مشتق ہے، استشراق سے، جس کا مادہ شرق ہے جو ضد متصور ہوتا ہے غرب کا، میں نے متصور ہوتا ہے، کہا، اس لیے کہ میرے نزدیک یہ تقسیم وتفریق حقیقی نہیں، اعتباری ہے اور غیر صحت مند

رجحانات کی پیداوار ہے، شرق و غرب کے دو باہم متضاد اور اردو میں مستعمل مترادفات مشرق و مغرب ہیں، عربی میں مستشرق ہی نہیں خود اس کا اسم یا مصدر استشراق بھی مولد یعنی نیا اور بعد کی پیداوار ہے، چنانچہ قدیم عربی لغات میں اس مادہ کا باب استفعال سرے سے مفقود ہے، جدید لغات یا قدیم لغات کے جدید ایڈیشنوں میں البتہ مستشرق اور استشراق کے الفاظ بطور اسم فاعل اور اسم مصدر کے ملتے ہیں، جن کا استعمال مخصوص بھی ہے اور محدود بھی، استشراق بطور فعل کے ان لغات میں بھی مذکور نہیں ہے، عربی یا اردو لٹریچر میں بھی یہ لفظ زیادہ پرانا نہیں ہے اور الفاظ پہلے استعمال میں آتے ہیں، اس کے بعد لغت میں جگہ پاتے ہیں اور حقیقت میں یہ الفاظ ترجمہ یا چربہ ہیں اورینٹلسٹ اور اورینٹلزم کا جو اورینٹ سے ماخوذ ہیں، انگریزی میں اورینٹ ایسٹ کا ہم معنی ہے، اہل مغرب نے یہ نام اپنے ان نام نہاد اسکالروں کو دیا جنہوں نے بزعم ان کے مشرقی علوم و فنون، زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کو جس میں مذہب بھی آجاتا ہے، اپنی دل چسپی کا موضوع بنایا اور ان کا خصوصی مطالعہ کرکے براہ راست ان سے واقفیت حاصل کی، عربی میں اس کے لیے کوئی لفظ پہلے سے موجود نہیں تھا، اس لیے جب اس کی ضرورت پیش آئی تو انگریزی ہی کی طرز پر الفاظ وضع کر لیے گئے۔

ثلاثی مزید کے ابواب میں سے باب استفعال جس کے وزن پر استشراق بنایا گیا ہے، اس کی ایک خاصیت صیرورۃ اور اتخاذ ہے، جس میں بن جانا، اپنانا یا حاصل کرنا مفہوم ہوتا ہے، مثلاً استحجر الطین، مٹی پتھر بن گئی، استوطن القریۃ بستی کو اپنا وطن بنا لیا، استفاد، فائدہ حاصل کرنا، اسی اصول اور قاعدہ کے تحت جب کسی زمانہ میں کچھ لوگوں نے باہر سے آکر جزیرۃ العرب میں بود و باش اختیار کی اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ بھی عرب ہوگئے تو ان کو عرب کے قدیم اور اصلی باشندوں سے ممیز کرنے کے لیے اسی باب استفعال سے کام لے کر ایک لفظ بنایا گیا، استعرب، عرب بن گیا، چنانچہ عرب کی قدیم تاریخ میں عرب عاربہ اور عرب مستعربہ کی اصطلاحیں ملتی ہیں اردو میں ہم اسے اصلی عرب اور نقلی عرب بھی کہہ سکتے ہیں، نئے اور پرانے سچے اور جھوٹے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، اس مسئلہ کی میں نے تحقیق نہیں کی کہ عربی میں مستشرق اور استشراق کا لفظ پہلے پہل کس نے وضع کیا، اس کے واضع خود مستشرقین ہیں یا ان کے غیر، اگر خود مستشرقین ہیں تو ان سے چوک ہوئی اور اگر غیر ہیں تو ان کا

تیر نشانہ پر لگا، استشراق کی حقیقت اور اس کی تاریخ جن کی نظر میں ہے وہ تسلیم کریں گے کہ یہ نام ان کے لیے انتہائی موزوں ہے، خود یہ نام ان کا راز فاش کرتا ہے، ان کے چہرے سے نقاب اٹھا کر ان کی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے، حاصلِ کلام یہ کہ از روئے عربی زبان استشراق کے معنی ہوئے، بہ تکلف مشرقی بننا اور مستشرق کے معنی وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی یا مشرقی بنا اور ظاہر ہے کہ اس فعل کی نسبت کسی مغربی ہی کی طرف ہو سکتی ہے، خود کسی مشرقی کا مشرقی بننا مہمل سی بات ہے۔

مستشرقین کے نام میں بہ ظاہر بڑی معصومیت ہے اور نام ہی پر کیا موقوف ہے ان کے کام کو بھی دیکھیں تو بادی النظر میں اس میں برائی کی بات نظر نہیں آئے گی، آخر اس میں برائی کی کیا بات ہے، اگر بیچارے مغربی اسکالر اور مفکرین مشرقی علوم وفنون کی تحصیل و تحقیق میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، وقت ہی نہیں سرمایہ اور ذہنی صلاحیتیں بھی، وہ کام جو ہمیں کرنا چاہیے، بیچارے وہ کر رہے ہیں، کیا یہ ان کا احسان نہیں ہے، اہل مشرق پر سادہ لوح مشرق، سادہ لوح مسلمان ان کا احسان مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کو گلہ بھی ہے، ع

مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا

اس لیے کہ : ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

استشراق کی ابتدا کب اور کن حالات میں ہوئی اور اس کے پیچھے کیا مقاصد تھے، کس قسم کے اسکالروں نے اس کی طرف توجہ کی، ان کے اپنے حالات و کوائف کیا تھے، اس زمرہ سے تعلق رکھنے والے مختلف اسکالروں کا رویہ اور طرزِ عمل مشرق بالخصوص اسلام کے ساتھ کیا رہا ہے، ہمدردانہ یا غیر ہمدردانہ، حقیقت پسندانہ یا متعصّبانہ جانب دارانہ یا غیر جانب دارانہ یا جارحانہ اور معاندانہ، یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے اور اب بھی کوئی شخص ان کا تاریخی جائزہ لینا چاہے تو اس کی ضرورت یا افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر مجھے بالفعل ان سوالات سے تعرض نہیں کرنا ہے، یہ طول طویل بحثیں ہیں، جن سے صرف نظر کر کے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

اسلام حق کا پیغام لے کر آیا تو اس کے راستہ میں جو لوگ حائل ہوئے ان میں کفارِ قریش کے

علاوہ یہود و نصاریٰ بھی تھے، یہود و نصاری کی نفسیات بوجوہ اس باب میں کفار قریش سے مختلف تھیں، ان میں نسلی تعصب کے علاوہ مذہبی عصبیت بھی تھی، نسلاً ان کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کی دوسری شاخ حضرت اسحاق سے تھا، جبکہ داعیِ اسلام کا تعلق اس خاندان سے تھا جو حضرت اسمٰعیل سے چلا، مذہبی اعتبار سے یہود و نصاریٰ پہلے سے حاملِ کتاب تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ آخری نبی کی بعثت بھی ان ہی میں ہوگی، خاندانی رقابت کا یہ احساس ان میں اس حد تک غالب تھا کہ انہوں نے قبلہ اور ذبح عظیم کے واقعہ کی اصلیت کو چھپانے کے لیے خود اپنی کتابوں میں تحریفیں کیں، اسلام جب انہیں ایک غالب قوت کی حیثیت سے ابھرتا نظر آیا تو انہوں نے اس کا راستہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور حالات کے تحت ادل بدل کر وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو وہ کر سکتے تھے، ان ہی تدابیر میں سے ایک تدبیر وہ بھی تھی جسے آج کی زبان اور اصطلاح میں استشراق کا نام دیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی نسبت اسلام کا رویہ مذمت اور اظہار نکیر ہی ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے اس زمانہ میں موجود استشراق کی پردہ دری ان الفاظ میں کی ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ .	اس قرآن کی باتیں نہ سنو اور اس میں گڑبڑ پیدا کرو، شاید تم غالب آجاؤ۔

(حٰمٓ سجدہ ۴۱: ۲۶)

آج اسرائیل اور بعض باطل پرست فرقے قرآن مجید کے غلط نسخے چھاپ کر پھیلانے کی جو ناپاک کوششیں کر رہے ہیں، کیا وہ اس سلسلہ کی کڑی نہیں، جس کا ذکر مذکورہ بالا آیت میں کیا گیا ہے۔

اہل کتاب کے ایک گروہ نے یہ حربہ اختیار کیا کہ ان کے آدمی صبح اسلام لاتے اور شام کو دائرۂ اسلام سے نکل جاتے کہ اس طرح سے لوگ اسلام سے برگشتہ ہوں، جس کا ذکر آل عمران کی آیت ۷۲ میں کیا گیا ہے، وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔

باطل پرستوں کی ایک چال یہ بھی ہوتی ہے کہ کچھ دو اور کچھ لو کا معاملہ کر کے بیچ کا راستہ اختیار کریں، لیکن حق کے لیے یہ قابل قبول نہیں ہے، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی یہ حکمتِ عملی موجود

تھی، جس کی نشان دہی قرآن مجید نے سورۂ نون کی آیت ۹ میں کی ہے:

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ.	وہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم اپنے موقف سے ہٹو تو وہ بھی ہٹیں۔

یہ رجحان اس زمانہ میں ہی نہیں تھا بلکہ آج کے استشراق میں بھی موجود ہے، مسلم کرسچین ڈائیلاگ کے عنوان سے آج جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بیچ کی راہ نکال کر دفع الوقتی کی جائے، جب کہ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، وہ صاف صاف کہتا ہے کہ اُدْخُلُوْا فِیْ السِّلْمِ کَآفَّةً اس کے نزدیک دو ہی راستے ہیں، اسلام یا کفر، اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ، کی حکمت عملی اس کے نزدیک کفر ہی کی ایک صورت ہے، سورۂ بقرہ کی آیت ۸۸ میں اس طرز عمل کی نشاندہی کر کے صرف دنیوی ذلت اور عذاب آخرت کی دھمکی دی گئی ہے لیکن سورۂ نسا کی آیت ۱۵۰ میں اس روش کو حقیقی کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلاً اُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ حَقًّا.	اور وہ کہتے ہیں، بعض باتوں کو ہم مانیں گے اور بعض کا انکار کریں گے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کا راستہ اختیار کریں، یہی لوگ حقیقی معنوں میں کافر ہیں۔

قرآن مجید کی یہ چند آیات جو اوپر بیان کی گئیں، ان کے آئینہ میں ہم آج کے مستشرقین اور استشراق کا چہرہ برافگندہ نقاب دیکھ سکتے ہیں اور اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام ان کے بارہ میں کیا رائے رکھتا ہے، قرآن واشگاف الفاظ میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنے سے منع کرتا ہے اور ایسے لوگوں کو جو ان کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں، ان کو ان ہی میں شمار کرتا ہے، سورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ میں کس قدر دوٹوک انداز میں اس کی صراحت ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰىٓ اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔

عصر حاضر کے مستشرقین یہود و نصاریٰ نہیں تو اور کون ہیں؟ لیکن یا للعجب، کس قدر تعجب کا مقام

ہے کہ آج مسلمانوں نے ان ہی یہود و نصاریٰ کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے رسم و راہ رکھنا تو ایک طرف، ان کو استاد کا درجہ دے کر اپنے دل و دماغ کی زمام کار ان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے، اسلام اور مسلمانوں سے مستشرقین اور استشراق کے تعلق کے مختلف ادوار ہیں، ایک زمانہ میں انہوں نے مسلمانوں سے مختلف دنیوی علوم سیکھے، اس میں استادی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد انہوں نے عربی اور اسلامی علوم کی طرف توجہ کی اور بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ ان کے بھی امام بن گئے اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ آج کسی کو طبیعی اور سائنسی علوم میں ہی نہیں، عربی اور اسلامیات میں سندِ فضیلت لینی ہوتی ہے تو وہ یورپ اور امریکہ کی اُن جامعات کا رخ کرتا ہے جہاں یہ نام نہاد اسکالر دام تزویر بچھائے دانہ ڈال کر شکار کی گھات میں بیٹھے ہیں، کیا ان کا مقصد واقعی مسلمان نوجوانوں کو عربی اور اسلامیات پڑھا کر اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت کرنا ہے؟ پورے پورے شعبے انہوں نے اس لیے کھول رکھے ہیں کہ مسلمان ذہن تیار ہوں، اسکالر شپ میں بڑی بڑی رقمیں وہ اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل پیدا ہوں؟ کوئی ہوش مند ایماندار آدمی اس کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔

استشراق کی تاریخ یہاں پہنچ کر ایک نیا موڑ مڑ چکی ہے، وہ کام جو ایک صدی پہلے عیسائی مبغلین اور مستشرقین کر رہے تھے، اب اس کام کے لیے انہوں نے مسلمانوں میں سے آدمی تیار کر دیے ہیں، اقبال کا مصرع یاد آتا ہے، انہوں نے شاندار ماضی کے لیے کہا تھا، ؏

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

آج صنم خانہ، کعبہ سے پاسباں حاصل کر رہا ہے، پہلے اس طرح کی اکا دکا مثالیں تھیں، آہستہ آہستہ ان میں اضافہ ہوتے ہوتے ان کی تعداد اتنی ہوگئی ہے کہ ہم اسے استشراق کے ایک علاحدہ دور سے تعبیر کر سکتے ہیں، میں نے بہت سوچا کہ استشراق کے ان علم برداروں کو کیا نام دیا جائے؟ مستشرقین اور استشراق کی جو صحیح تعریف ہم نے آغاز کلام میں متعین کی تھی وہ تو ان پر صادق نہیں آتی، بعض لکھنے والوں نے ان کے لیے مستغربین لکھا ہے، مگر اس کی موزونیت میں مجھے کلام ہے، میں لفظیات اور اصطلاحات کے ماہرین کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس کے لیے کوئی مناسب لفظ تجویز کریں۔

شیطان اس دنیا میں انسان کو گمراہ کرنے کا مشن لے کر آیا تھا، اس کو جب انسانوں میں ہی ایسے شاگرد مل گئے جو اس کے مشن کی اس سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تکمیل کرنے لگے تو وہ فارغ ہو گیا، اسی طرح ہمارے مستشرقین بھی اب فارغ ہو چکے ہیں، کچھ وقت گزرنے کے بعد ان کا نام صرف تاریخ میں باقی رہ جائے گا لیکن اسلام رہے گا اور اسے مستشرقین کی جگہ اس نئی مخلوق سے واسطہ ہوگا جو کام ان ہی کا کرے گا لیکن اس کا نام کچھ اور ہوگا اور یہ مشیت الٰہی ہے جو لوگ اسلام کے نام لیوا ہیں، دل سے اسلام کی حقانیت کے قائل ہیں، وہ خبردار ہو جائیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

اس مقالہ کے ختم ہونے کے بعد خاکسار نے جناب سید سیاح الدین کاکاخیل کو یہ کہہ کر اپنا مقالہ پڑھنے کی زحمت دی کہ وہ مدرسہ اشاعت العلوم جامع مسجد فیصل آباد کے مہتمم اور صدر مدرس ہیں اور اسی کے ساتھ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک اہم رکن ہیں، جس موثر انداز میں وہ اپنا مقالہ پڑھیں گے اس سے سامعین ضرور متاثر ہوں گے۔

جناب سید سیاح الدین کاکاخیل صاحب: حمد للہ رب العالمین اور صلوٰۃ وسلام بر سید المرسلین کے بعد عرض ہے کہ فرانسیسی ڈاکٹر گستاؤلی بان کی کتاب ''تمدن عرب'' ایک مشہور کتاب ہے، میں نے اکثر علمی مقالات ومضامین میں اس کے حوالے پڑھے تو ذہن پر یہ اثر تھا کہ یہ ایک نہایت عمدہ تحقیقی تصنیف ہوگی، جس میں مصنف نے پوری فراخ دلی کے ساتھ اور کسی قسم کے تعصب کے بغیر تاریخی حقائق بیان کیے ہوں گے، اس لیے عرصہ سے شوق تھا کہ میں اس کتاب کا مطالعہ کر کے علمی استفادہ کروں چنانچہ میں نے اس کا اردو ترجمہ حاصل کیا، جو شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی نے کیا ہے اور جو بارہا شائع ہوا ہے اور پاکستان میں اس کو مقبول اکیڈمی لاہور نے اشرف پریس لاہور سے ۱۹۶۰ء میں طبع کر کے شائع کیا ہے، اس کا مطالعہ شروع کیا، صفحہ ۱۷۷ سے جہاں اس نے رسول اللہ ﷺ کے حالات زندگی تحریر کیے ہیں اور ان پر تبصرہ کیا ہے، پڑھ کر دل کو انتہائی صدمہ ہوا اور احساس یہ ہوا کہ شاید یہ ساری کتاب اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے کہ تاریخی اور علمی تحقیق وتدقیق کے عنوان سے پوری تفصیل کے ساتھ دلچسپ انداز میں مسلمانوں کی ترقیوں کا ذکر کر کے لوگوں کے اذہان کو مسحور کیا جائے اور ان کو یہ تاثر دیا جائے کہ مصنف ایک بڑا فراخ دل اور غیر متعصب محقق ہے اور وہ جو کچھ لکھتا ہے پوری تحقیق کے بعد

عالمانہ انداز میں ہر قسم کی تنگ دلی اور تعصب سے مبرّا ہو کر لکھتا ہے اور یہ تاثر دینے اور قلوب و اذہان کو معتقد بنا دینے کے بعد جو زہر افشانی اور خبث نفس کا مظاہر آنحضرت ﷺ کی ذات مقدس کے بارے میں کر سکتا ہے، وہ ایک خاص انداز سے کرے گا اور مطالعہ کرنے والے کے دماغ کو مسموم کر کے اس میں ایسے خیالات بھر دے گا کہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں عقیدت باقی نہیں رہ سکے گی اور جب مسلمانوں کو اس ذات اقدس کے بارے میں بدگمان کر دیا جائے تو پھر ان کا دین و ایمان کہاں باقی رہے گی اور پھر آگے جا کر مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی ترقیوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ سب فضول و بے کار ہو گی۔

اس مطالعہ کے بعد دل کو جو صدمہ پہنچا میں نے بعض احباب سے اس کا ذکر کیا، تو مجھے بتایا گیا کہ علامہ شبلیؒ نے ان ساری باتوں کی تردید کی ہے، مگر میں نے ابھی تک اس کا مطالعہ نہیں کیا ہے، میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ حاصل کروں۔

بہر حال لی بان نے جو کچھ لکھا ہے، یا دوسرے مستشرقین جو کچھ اپنی کتابوں میں اس قسم کے خرافات اور زہریلے مضامین لکھتے ہیں، ان سے تو ہمیں کوئی شکایت اس لیے نہیں کہ ان سے کسی خیر کی توقع رکھنا ہی فضول ہے اور یہ تصور کرنا کہ وہ واقعۃً غیر متعصب اور حقیقت شناس و حقیقت پسند بن کر صحیح واقعات پیش کریں گے اور صحیح نتائج اخذ کر کے بیان کریں گے، ناممکن ہے، یہ عقربی نیش زنی تو ان کی طبیعتوں کا تقاضا ہے اور وہ کبھی بھی اور کہیں بھی اس سے رکیں گے نہیں لیکن مجھے بار بار حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ سید علی بلگرامی نے اس کا اردو ترجمہ بڑے اہتمام اور دیدہ ریزی سے کیا، جیسا کہ وہ مقدمہ میں اس کا تفصیلی ذکر کرتا ہے، ٹائٹل ہی پر کتاب کے نام کے ساتھ یہ بھی تصریح ہے ''مع توضیحات اور حواشی اردو میں ترجمہ کیا اور واقعۃً کتاب میں مترجم نے جگہ جگہ توضیحات بھی کی ہیں، طویل حاشیے بھی لکھے ہیں، مگر جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے بارے میں ان خرافات اور لغویات کا ترجمہ کر کے اس کو یہ خیال نہیں آیا کہ حاشیہ پر اپنی طرف سے ان کی مفصل و مدلل تردید کی جائے اور لی بان کے ان گستاخانہ کلمات کے جواب میں تحقیقی طور پر اس قدر لکھا جائے کی لی بان کی ایسی دل آزار عبارتیں پڑھنے والے مسلمان کا دل اگر ان کو پڑھ کر زخمی ہوا ہے تو مترجم کا وہ جواب اس زخم کے اندمال کے لیے

مرہم بن سکے اور جو صدمہ اس کو پہنچا ہو اس کی تلافی اور تسکین کا سامان تو ہو جائے اور اگر آنحضرت ﷺ کے صحیح حالاتِ زندگی اور آپ کی سیرت طیبہ کے واقعات سے کوئی ناواقف عام مسلمان یا کوئی غیر مسلم اس کو پڑھ کر شکوک وشبہات میں مبتلا ہو اور آنحضرت ﷺ کی ذات پاک کے بارے میں غلط تصور قائم ہو تو تردیدی حواشی پڑھنے کے بعد اس کے شک وشبہ کا پورا پورا ازالہ ہو اور غلط تصورات کے بہ جائے وہ حقیقت حال کو سمجھ کر صحیح تصور قائم کرے، لی بان نے جو کچھ لکھا ہے وہ نری جہالت اور استشراقی تعصب کا بدترین مظاہرہ ہے، ان غیر تاریخی اور حقیقت سے کوسوں دور خرافات کو لکھ کر وہ جو مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا، نہ صرف ایک مسلمان محقق کی حیثیت سے جس کے عقیدوں کے خلاف باتیں لکھی گئی تھیں، ایک عام حقیقت شناس وحقیقت پسند منصف مزاج مورخ کی حیثیت سے بھی جناب سید علی بلگرامی کا یہ فریضہ تھا، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس قدر اہم فریضہ سے غفلت کیوں برتی اور اس قدر لغویات کا ترجمہ کرتے وقت ان کو بالکل خیال نہیں آیا کہ ان پر گرفت نہ کرنا اور خاموش گزرنا ایک علمی خیانت اور مطالعہ کرنے والے ناواقف لوگوں پر ظلم ہے، بارہا یہ کتاب مترجم کی وفات کے بعد بھی شایع ہوئی لیکن کسی ناشر نے مسلمان ہونے کے باوجود اس طرف توجہ نہیں کی، اگر مترجم سے یہ فروگزاشت ہوئی تھی، وجہ اس کی جو کچھ بھی ہو تو بعد کے ناشرین کو تو چاہیے تھا کہ وہ اس کی تلافی کرتے اور کسی اچھے محقق عالم سے ان کی تردید لکھوا کر ساتھ ہی شائع کرتے، اہل علم کے اس عظیم مجمع میں پورے درد دل کے ساتھ اپنی یہ درخواست پیش کرتا ہوں کہ وہ اس حصۂ کتاب کی تمام زہریلی اور گستاخانہ عبارتوں کی مدلل تردید لکھ کر کتاب کے ناشرین کو مجبور کریں کہ اگر وہ کتاب میں سے اس حصہ کا نکالنا اپنے خیال میں خیانت سمجھتے ہوں تو اس کے ساتھ یہ تردید اور شکوک وشبہات کا ازالہ بھی ضرور شائع کریں اور علمی رسائل میں وہ تردیدی مضمون بار بار شائع ہوتا کہ بدقسمتی سے جن لوگوں نے یہ کتاب پڑھی ہے اور اس حصۂ کتاب کو پڑھ کر ان کے اذہان کچھ ماؤف ہوئے ہوں تو وہ اس تردیدی مضمون کے مطالعہ کے بعد اپنے اذہان کو صاف کر سکیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا اردو ترجمہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے نام سے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں عرصۂ دراز سے ہو رہا ہے اور قسط وار شایع ہوتا رہتا ہے، اس میں بعض مقالات مستشرقین اور

یہودی فضلا کے لکھے ہوئے ہیں اور ان میں بھی وہ علمی خیانت سے کام لے کر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ڈنک مارتے رہتے ہیں اور اس انداز سے کہ بہ ظاہر وہ ایک معمولی سا اشارہ کر جاتے ہیں کہ جو شخص بھی اس کو پڑھ کر اس کو ایک علمی حقیقت سمجھ کر جذب کر لے تو پھر آگے سوچتے ہوئے اس کا ذہن ایک غلط لائن پر پڑ جاتا ہے اور بہ ظاہر معمولی طور پر ذہن کا کانٹا بدل دینے کے بعد وہ مطالعہ کرنے والے کو ایک ایسی لائن پر لگا کر آگے چلاتے ہیں کہ وہ منزل مقصود سے بہت دور نکل جاتا ہے تو ضرورت تھی کہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ ایسے زہریلے کانٹوں کی نشاندہی بھی کی جاتی اور اذہان سے ان کے اثرات نکالنے کی بھی علمی کوشش ہوتی، یہ بات دراصل لاہور میں کہنے کی تھی، مگر پہلی دفعہ منتخب اہل علم کا مجمع مجھے یہاں ملا ہے، اس لیے اگر اس ندوۂ علمیہ اور محفل فضلا کی طرف سے کوئی ایسی قرارداد ہو جائے جو اس دارالترجمہ کے ذمہ داروں کو متوجہ کر سکے تو شاید وہ زیادہ موثر ہوگا اور ان کو متوجہ کر سکے گا، اگرچہ میں کوشش کروں گا کہ اپنی آواز وہاں بھی پہنچا کر ترجمہ کرنے والے حضرات کو اس طرف متوجہ کر سکوں، یہ استشراق ایک بہت بڑا فتنہ ہے، جس کے مضر اثرات سے ہر میدان میں نئی نسل کے مسلمان نوجوانوں کو بچانا ضروری ہے، الاستاذ یوسف القرضاوی نے بالکل درست فرمایا ہے کہ مستشرقین سے بڑھ کر خطرہ ان کے شاگرد مستغربین کا خطرہ ہے جو مسلمانوں کے لباس میں ملبوس ہو کر ہمارے تعلیمی اداروں میں ان مستشرقین کے نظریات وخیالات اور تحریفات وخرافات پھیلاتے اور نوجوان طلبہ کے ذہن مسموم کرتے ہیں، اس زہر ہلاہل کا تریاق مہیا کرنا اس وقت علم دین اور دین اسلام کی بہت بڑی اور نہایت ضروری خدمت ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

جناب مفتی سیاح الدین کاکاخیل کے مقالہ کے بعد جناب عابد رضا بیدار صاحب ڈائرکٹر خدابخش لائبریری پٹنہ نے ایک سوال کے ذریعہ یہ جاننا چاہا کہ اگر پاکستان میں مستشرقین کی رد میں کوئی کام ہو رہا ہو تو وہ اس مجلس میں سامنے آنا چاہیے، اس کا جواب جناب طفیل احمد صاحب نے یہ دیا:

مستشرقین اور قرآن کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ جناب مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے تحریر فرمایا جو پہلے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ فکر ونظر میں طبع ہوا، اس کے بعد اس کے ترجمے کئی زبانوں میں ہوئے اور جب ہمارے ادارہ تحقیقات اسلامی نے اپنے کام کو تقسیم کیا تو اس میں ایک

خاص شعبہ اسلام اور اس کے درپیش مسائل کے نام سے قائم کیا گیا، اس شعبہ کے ذریعہ اسلام سے متعلق جو غلط افکار و خیالات رائج ہو رہے ہیں، ان کی تردید اور ان کے جوابات لکھنے کا مناسب انتظام کیا جاتا ہے، پنجاب یونیورسٹی سے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی مختلف جلدیں شائع ہوئی ہیں، ان میں مستشرقین کے قسم کے مقالہ نگاروں کے مضامین میں جو غلط فہمیاں ہوتی ہیں ان کا ترجمہ کرتے وقت ان کی نشاندہی کی جاتی ہے اور ان کی نشاندہی اس طرح کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے سامنے یہ غلطیاں آئیں اور وہ ان کے جوابات دینے کے لیے آمادہ ہوں، ہمارا ادارہ بھی مستشرقین کی تحریروں کو پڑھتا ہے اور ان کے گمراہ کن دلائل کے جوابات دینے کی پوری کوشش کرتا ہے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کی مجموعۂ قوانین اسلام کی مختلف جلدوں کا ذکر کیا جو ان کے ادارہ سے شائع ہوئی ہیں، ان کے خیال میں ان جلدوں سے اسلامی قوانین کے متعلق مستشرقین کی بہت سی غلطیاں اور غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد خاکسار نے ڈاکٹر طفیل صاحب کو اپنا مقالہ پڑھنے کے لیے سامعین سے یہ کہہ کر زحمت دی کہ جس شوق سے وہ اس سمینار میں دور دراز مقام سے سفر کر کے شریک ہوئے ہیں، امید ہے کہ اسی شوق سے حاضرین ان کا مقالہ سماعت فرمائیں گے۔

ڈاکٹر محمد طفیل صاحب: میرے مقالہ کا موضوع ہے، جوزف شاخت اور اصول فقہ، مقالہ کو میں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور تیسرے حصہ میں سے تھوڑا سا اقتباس پڑھنے کی اجازت چاہوں گا، شاخت صاحب کا ایک اقتباس ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ اسلامی قانون براہِ راست قرآن حکیم سے اخذ نہیں کیا گیا، اسلامی قانون کا خمیر بنی امیہ کے انتظامی عمل سے اٹھایا گیا اور یہ کہ بعض اوقات بنی امیہ کا عمل قرآن حکیم کے الفاظ پر بھاری ہو جاتا ہے، میں اس کے جواب میں کچھ عرض کرتا جاؤں گا، مذکورۂ بالا امور میں سب سے پہلا قرآن حکیم کے قانونی ماخذ ہونے کے بارے میں ہے کہ ابتدائی دور میں قرآن سے بہ حیثیت ماخذ قانونی استفادہ نہیں کیا گیا، یہ کلیہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، ہمیں شاخت کا یہ اصول اور عندیہ محل نظر دکھائی دیتا ہے، نبی کریم ﷺ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد میں قرآن حکیم سے مکمل استفادہ کیا جاتا رہا، چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے، زانیوں کو کوڑے لگائے گئے، شرابیوں پر تعزیر نافذ ہوئی، بہت سے لوگوں کو ملک بدر کیا گیا، نکاح و طلاق نیز وراثت کی

تقسیم کے فیصلے قرآن حکیم کے احکام کے مطابق کیے گئے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن حکیم کے یہ سارے احکام مسلمانوں میں ابتدائی دور سے ہی اپنا لیے گئے تھے اور ان پر عمل ہوتا رہا، اس کے علاوہ دوسری بات میں یہ کہنا چاہوں گا کہ قرآن حکیم یقینی طور پر تمام جزئیات کا احاطہ نہیں کرتا، بلکہ وہ قانون اسلامی کے اصولوں سے ہمیں روشناس کرتا ہے، شاخت صاحب نے نتائج اخذ کرتے وقت غالباً جزئیات کو پیش نظر رکھا ہوگا، اسی وجہ سے انہوں نے ٹھوکر کھائی ہے، دوسری بات یہ کہ اسلامی قانون کو بنی امیہ کے دور میں قانونی شکل اس وقت ملی جب بنی امیہ کا عمل اس میں داخل ہوا، یہ بھی ایک ایسی تاریخی غلطی ہے جو شاخت کے تعصب کی غماز ہے، دوسری بات یہ کہ حدیث شریف دوسری صدی تک موجود نہ تھی، اس کے علاوہ انہوں نے یہ بات بھی کہی کہ جب حدیث نبویؐ کو جمع کیا گیا، اس وقت وہ اصلی حالت میں موجود نہ تھی، اس میں معاشرتی عمل بھی شامل ہو گیا تھا، گویا سنت نبویؐ جو ہمارے قانون کا دوسرا بڑا ماخذ ہے وہ بھی صحیح معنوں میں ہم تک نہیں پہنچ سکا، بلکہ اسے تاخیر سے مرتب کیا گیا اور جب مرتب کیا گیا تو اس میں معاشرتی عمل بھی شامل ہو گیا، اس حقیقت سے جوزف صاحب نے غالباً آنکھیں بند کرلیں کہ حدیث کو جمع کرنے کا عمل عہد صحابہؓ ہی میں شروع ہو گیا تھا اور بہت سے صحیفۂ صادقہ، صحیفۂ حضرت علی جو اب تک ہمارے سامنے آچکے ہیں وہ صحابۂ کرام کے دور میں ہی مرتب ہو چکے تھے، بعد میں حدیث کے ذخیرہ کو صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کی شکل میں جمع کر دیا گیا اور ان کا یہ کہنا کہ جب حدیث کو جمع کیا گیا تو بنی امیہ کے دور کا معاشرتی عمل شامل ہو گیا، ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، جب کہ مسلمان کے لیے نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ:

من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار.	جس نے میری طرف قصداً جھوٹ کی نسبت کی اس کو جہنم میں اپنا مقام بنالینا چاہیے۔

اس حدیث کی موجودگی میں کوئی کیسے جرأت کرسکتا ہے کہ معاشرتی عمل کو حدیث کا درجہ دے، پھر ہمارے یہاں جرح وتعدیل کا جو اتنا وسیع ذخیرہ اور اتنا بڑا قانون موجود ہے، اس کے پیش نظر ہم کھرا کھوٹا الگ کر سکتے ہیں اور پرکھ سکتے ہیں اور آج بھی ہمارے پاس یہ قاعدے اور کلیے موجود ہیں تا کہ ہم الگ کر کے دکھا دیں کہ یہ حدیث ہے اور یہ حدیث کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، چاہے وہ معاشرہ

کا عمل ہو یا کسی کی گھڑی ہوئی کوئی بات ہو، ان حقائق کی موجودگی میں جوزف شاخت نے ہمارے قانون کے ماخذ کا درجہ گھٹانے اور اس میں شک وشبہہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ہمیں ان کے تعصب کی ایک سازش نظر آتی ہے، جس کو حقیقت اور تاریخی شواہد سے کوئی تعلق نہیں، ان الفاظ پر میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

اس مضمون کے خاتمہ کے بعد خاکسار نے عرض کیا کہ وقت کی کمی کی وجہ سے شاید آپ سوال نہ کریں، اس لیے اب ہمارے صدر صاحب اپنے تاثرات بیان کریں گے۔

سید حامد صاحب: حضرات! وقت کم ہے، میں تبصرہ میں وقت نہیں لوں گا، پاکستان کے علمائے کرام کا یہ زریں سلسلہ آپ کے سامنے آیا، انہوں نے اپنے خیالات، اپنے تجربات، اپنی بصیرت سے آپ کو آگاہ کیا، پہلے فاضل مقرر کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے جس سادگی کے ساتھ بہت سے مسائل کو طے کیا، اس میں ادب کی تنقیدی زبان کو اگر استعمال کیا جائے تو اسے سہل ممتنع کہا جائے گا، یہ بات صحیح ہے کہ مستشرقین نے جس عناد کا مظاہرہ وقتاً فوقتاً کیا، اس میں اس ذہنیت کو بھی دخل ہے جو ماضی میں کسی مفتوح کو فاتح سے رہتی ہے، جناب شرف الدین صاحب نے مستشرقین، استشراق اور اسلام سے متعلق اپنا مقالہ پڑھا اور استشراق سے متعلق انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یقیناً قابل توجہ ہے، انہوں نے فرمایا کہ استشراق یعنی بہ تکلف مشرقی بننا، اب اگر کوئی شخص بہ تکلف مشرقی بنتا ہے تو ظاہر ہے اس میں بناوٹ تو آ ہی جاتی ہے لیکن مستثنیات میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ کوئی شخص عقیدت کی بنا پر مشرقی بننا چاہتا ہے، مفتی سیاح الدین کا کاخیل نے بڑی فراست کے ساتھ اس طرز عمل کی نشاندہی کی ہے کہ مستشرقین کا ایک گروہ یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ شروع میں قلوب واذہان کو متاثر کرے اور یہ تاثر قائم کرے کہ مصنف غیر جانب دار بلکہ ہمدرد ہے اور پھر اس کے بعد دو چار باتیں ایسی کہہ دے جو ہمیشہ کے لیے جراحت کا سامان رکھتی ہوں، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جن کتابوں کے ترجمے کیے جائیں، ان کے حواشی میں اس کا التزام رکھا جائے کہ جن باتوں سے مترجم کو اختلاف ہے، اس کی تردید اور توجیہ ہو سکے، جناب محمد طفیل صاحب نے اپنے مقالہ میں جوزف صاحب کی دو باتوں کی تردید کی ہے، ایک تو یہ کہ قرآن کو فقہ واسلامی قانون کا مصدر نہیں بنایا گیا اور دوسری بات یہ کہ

حدیث کا مجموعہ دوسری صدی تک نہ تھا اور جب اس کو مدون کیا گیا تو اس میں بنی امیہ کا معاشرتی عمل بھی شامل ہو گیا، اس کی بہت مدلل تردید آپ نے کی، میرے خیال میں اب اس مجلس کو ختم کیا جائے۔

چوتھی نشست : چوتھی نشست کی صدارت جناب حکیم محمد سعید دہلوی ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان نے کی اس کی کاروائی کو آگے بڑھانے کے فرائض جناب ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری نے انجام دیے، آغاز جناب حکیم محمد سعید صاحب نے سورہ بقرہ کے آخری رکوع کی تلاوت سے کیا، مقالہ خوانی شروع ہونے سے پہلے ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری نے کہا کہ اس میں سب سے پہلا مقالہ جناب مولانا تقی الدین ندوی کا ہے، جن کے مقالہ کا موضوع السنة مع المستشرقين والمستغربين ہے، اس کو جناب مقالہ نگار نے عربی میں لکھا ہے، میرے ذمہ جو ناخوشگوار فرض ہے اس کا اثر متعدد اصحاب پر پڑے گا اور میں کانفرنسوں میں شریک ہوتا رہتا ہوں، لہٰذا خود بھی اس کا شکار ہوتا ہوں، زیادہ سے زیادہ وقت جو مقالہ نگار کو دیا جا سکتا ہے، وہ پندرہ منٹ ہے، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ مقالہ نگار حضرات پورا مقالہ پڑھنے کے بجائے اس کا خلاصہ پیش کریں، یا اس کے اہم اقتباسات کو پڑھیں، اس لیے کہ دس منٹ سوالات اور بحث و مباحثہ کے لیے بھی ہوں گے، مجھے یہ گزارش پہلے تو ڈاکٹر تقی الدین صاحب سے کرنی ہے اور ان کے بعد اور مقالہ نگار حضرات سے بھی ہے۔

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری : مولانا نے پہلے عربی میں اپنے مقالہ کے اقتباسات پڑھے اور پھر اردو میں اس کا خلاصہ اس طرح بیان کیا کہ علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے خاص طور سے سیرت اور سنت کے باب میں مستشرقین کے اقوال کا جو مواخذہ کیا ہے اور ہم کو جو راہ بتائی ہے، اس کے متعلق ارادہ تھا کہ میں بھی کچھ لکھوں، ہندوستان میں جب انکار حدیث کا فتنہ پیدا ہوا تو سید صاحبؒ نے اس کے خلاف "السنة وما الحاجة اليها" لکھی جو عربی میں بھی چھپی ہے، یہ مشہور و معروف کتاب ہے، میں نے اس کا بھی ذکر کیا ہے، میں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ مستشرقین کے انکار حدیث سے نئے تعلیم یافتہ لوگ متاثر ہوئے ہیں، جن میں بڑے اہل قلم، اہل زبان شامل ہیں اور جن کا عالم عربی اور عالم اسلام میں بڑا اثر ہے، مثلاً احمد امین، انہوں نے جس طرح حدیث کے بارہ میں خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کا کوئی تعلق اسلام اور اسلامی تعلیمات سے نہیں ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ

احمد امین نے علمی خطا کی ہے، یہ علمی غلطی نہیں، تحریف ہے، وہ گولڈ زیہر اور اس قسم کے دوسرے مستشرقین سے اتنا متاثر ہیں کہ ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے، اس کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا ہے، اسی طرح موجودہ علما میں استاذ فواد سزگین ہیں، جن کی بڑی شہرت ہے اور ان کی کتاب "تاریخ التراث العربی" بڑی اہم کتاب ہے، اس کتاب کی دوسری جلد میں انہوں نے تقریباً تیس صفحوں کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے، جس میں انہوں نے علم حدیث کے تطورات، تفصیلات اور کتابت کے بارہ میں مختلف رایوں کا اظہار کیا ہے، اس میں سے بعض اقتباسات میں نے اس مقالہ میں نقل کر دیے ہیں، امام بخاریؒ کے متعلق انہوں نے سخت تنقید کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام بخاری کے زمانہ سے گویا اسناد میں انحطاط کا دور شروع ہوا، بدأ الامام البخاری من الانبیار فی الحدیث، یعنی امام بخاری کے زمانہ سے گویا اسناد کی اہمیت کم ہوگئی، کتاب الصحیح میں امام بخاری کا جو مقصد ہے، اس کو فؤاد سزگین سمجھے نہیں، امام بخاری نے تقریباً تیرہ سو معلق حدیثیں یعنی بغیر سند کے نقل کی ہیں لیکن ان میں اکثر احادیث کی اسانید امام بخاری نے کتاب کے اندر خود نقل کر دی ہیں، سوائے ایک سو تینتالیس حدیثوں کے اور ان حدیثوں کی اسناد کو حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب ''تغلیق التعلیق'' میں بیان کر دیا ہے، اس کتاب کو ایک صاحب نے ایڈٹ کیا ہے اور وہ چھپ بھی گئی ہے، اس میں رجال و رواۃ پر حافظ ابن حجر نے پوری گفتگو کی ہے، امام بخاری نے حدیث معلق کو ضمناً اور استشہاد کے طور پر نقل کیا ہے، وہ اصل کتاب کا موضوع نہیں لیکن فؤاد سزگین نے مستشرقین سے متاثر ہو کر یہ کہہ دیا کہ گو امام بخاری نے اسناد کی اہمیت کو کم کر دیا ہے، پھر جب فؤاد سزگین سے مناقشہ کیا گیا کہ یہ تو بڑی علمی غلطی ہے، حدیث معلق کے معنی وہ نہیں ہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں تو وہ اپنی رائے سے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہوئے، بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں، وقت ختم ہو گیا ہے۔

مولانا تقی الدین ندوی کے بعد جناب مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند نے عربی میں اپنا مقالہ پیش کیا، مقالہ کا موضوع تھا "نظرة خاطفة علی موضوع الاسلام والمستشرقین" مولانا نے اردو میں بھی اس کا خلاصہ زبانی پیش کیا۔

مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی: مولانا نے فرمایا کہ میں کم سے کم وقت لوں گا، الاسلام و المستشرقون کے موضوع پر دارالمصنفین کے اندر اس اجتماع کا منعقد ہونا اور ہندوستان اور باہر کے

بڑے بڑے لوگوں کا جن کا علمی مقام و درجہ ہے، حصہ لینا اس بات کی خوش خبری ہے کہ انشاء اللہ اس موضوع کا حق پوری طرح سے ادا ہوگا، اسی کے ساتھ اس بیداری کا بھی پتہ چلتا ہے جو ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر اور عالم اسلام میں پائی جاتی ہے، اس قسم کا کوئی بھی اجتماع کسی بھی اسلامی ملک میں ہوسکتا تھا لیکن ہندوستان کا استحقاق کچھ کم نہیں، اس سلسلہ میں دارالمصنفین کی نمایاں خدمات ہیں اور جس کی صدارت میرے رفیق دوست مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ذمہ ہے، اس لیے اس کا زیادہ استحقاق تھا اور یہ اجتماع یہیں ہونا چاہیے تھا، اسی کے ذیل میں میں نے اپنے مقالہ میں دارالمصنفین کی علمی خدمات کا ذکر کیا ہے، یہاں سے شائع ہونے والی کتابوں کا بھی نام لیا ہے، جو ایک طرح سے سارے عالم اسلام کے لیے قیمتی سرمایہ ہے، مستشرقین کے بارہ میں میں اپنے تاثرات کا اظہار مختصر طریقہ پر کردینا چاہتا ہوں، میں نے یہ لکھا ہے کہ مستشرقین کی جو خدمات ہیں، ہم کو ان کی قدر کرنی چاہیے، اس کی طرف سے غفلت کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ان کی کوششوں کی بدولت بہت سی قیمتی قدیم کتابیں حاصل ہوسکیں، جن سے بہت سے لوگ واقف نہیں تھے اور وہ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں دفن تھیں، بہرحال بہت قیمتی چیزیں ہیں اور ان سے ہم بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن مستشرقین کی کوششوں کے سلسلہ میں ہم کو چند باتیں مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے جو کوششیں ہماری قدیم کتابوں کو شایع کرنے کے سلسلہ میں کی ہیں وہ کسی بڑے مقصد کے لیے نہیں تھیں، بلکہ درحقیقت ان کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب یورپ کا سیاسی غلبہ ساری دنیا پر ہو چکا تھا اور اس کی ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ مشرق کے افکار و حالات سے واقفیت کی جائے، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مستشرقین سامنے آئے، دوسری چیز جس کو پیش نظر رکھنے کی ضررت ہے، وہ یہ ہے کہ چاہے یہ لوگ جو بھی خدمات انجام دے رہے ہوں، ان میں استثنا ضرور ہے لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جو صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت کے اثرات سے بالاتر نہیں ہوسکے ہیں اور اسی بنا پر کم لوگ ہیں جو حق کو جاننے کے بعد اس کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے تیار ہوں، میں نے مثالیں دی ہیں کہ کس کس طرح ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو مجروح کرنے اور اسلام کو غلط شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام اور مستشرقین کے

سلسلہ میں اپنے مختصر خیالات کے بعد میں نے دو تین باتوں پر خصوصیت سے توجہ دلائی ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ جب تک مستشرقین کو یہ مقام حاصل رہے گا کہ وہ علوم اسلامی کے سلسلہ میں مستند و مرجع سمجھے جاتے رہیں، اس وقت تک بلاشبہ ان کو موقع ملتا رہے گا، کہ وہ مسلمانوں میں شکوک وشبہات پیدا کرتے رہیں، اس لیے ہمیں غافل نہ رہنا چاہیے، ہم کو آگاہ ہوکر مسلمانوں کو آگاہ کرتے رہنا چاہیے کہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کیا کوششیں ہورہی ہیں تاکہ ان کا مناسب جواب دیا جاسکے، دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کے فضائل، مناقب اور محاسن اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے مثبت انداز میں ہمیں چیزیں شائع کرنی چاہئیں، جن کا علمی اور تحقیقی لحاظ سے درجہ بہت بلند نہ ہو تو مستشرقین کی کتابوں سے فروتر بھی نہ ہو، اس لیے کہ اس کے بغیر ہم لوگوں کو ان کی کتابوں کے مطالعہ سے باز نہیں رکھ سکتے، جب تک کہ اس کا صحیح بدل نہ مہیا ہو، آخری بات جس پر میں نے زور دیا ہے کہ جہاں یہ دونوں باتیں ضروری ہیں کہ ان کی غلط باتوں سے واقف ہونے کے بعد بروقت تردید کی جائے اور اسلام کے تعارف کے لیے نئی نئی چیزیں شائع کی جائیں، وہاں میرے نزدیک سب سے بڑی ضرورت یہ بھی ہے کہ ہم اسلام کو ایک زندہ نمونہ کے طور پر دنیا کے سامنے اپنے انفرادی اور اجتماعی عمل کے ذریعہ لانے کی کوشش کریں، تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ واقعی اسلام کیا ہے، رسول اللہ ﷺ کی سیرت کیا تھی، ہم اپنے عمل سے یہ ثابت کریں کہ رسول اللہ ﷺ صرف مسلمانوں کے رسول نہ تھے، بلکہ آپ تمام دنیا کے لیے ہادی ورہنما بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپ ہی کی دینی تعلیمات میں ساری مشکلات ومسائل کا حل مستتر ہے، جن سے اس وقت دنیا دوچار ہے، آخر میں میں نے اپنے محترم دوست سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے اس جلسہ میں شرکت کی دعوت دے کر مجھے اس کا موقع عنایت فرمایا کہ میں آپ حضرات کے افکار وخیالات سے استفادہ کرسکوں اور باہر کے اور ملک کے گوشہ گوشہ سے جو مہمان آئے ہیں، ان کی ملاقات سے مشرف ہو سکوں، والسلام علیکم۔

ظفر اسحاق صاحب: مولانا کے اس مقالہ کے بعد جناب ظفر اسحاق انصاری صاحب نے کہا کہ مولانا کے اس مقالہ میں بڑی قیمتی تجاویز ہیں اور بڑے قیمتی مشورے ہیں، خاص طور پر مسلمان اہل علم کے لیے

بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے، اس لیے کہ علمی میدان میں کام کرنے والے خواہ سب لوگ نہ ہوں لیکن اسلام پر عمل کرنے کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ہے اور جب تک اسلام کا صحیح نمونہ سامنے نہ آجائے، اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے، ہم کچھ کہیں لیکن دنیا کی ریت یہی ہے کہ وہ درخت کو اس کے پھل سے پہچانتی ہے، تو ہم سب مولانا کے ان قیمتی مشوروں اور تجویزوں کے لیے ان کے شکر گزار ہیں، ابھی متعدد اہم مقالے پیش ہونے ہیں، اگر کوئی انتہائی اہم سوال ہے تو اس کی گنجائش موجود ہے لیکن اگر کوئی بہت زیادہ اہم سوال نہیں ہے، تو میری گزارش ہے کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں اگلے مقالہ نگار کو زحمت دوں، اس کے بعد جناب سید حامد صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ کے مقالہ کا عنوان ہے "عوامل اور ردعمل"

سید حامد صاحب : سید حامد صاحب نے فرمایا کہ میرے خیال سے وقت بہت کم ہے، شروع میں چند عنوانات کا ذکر کیے دیتا ہوں جو وقت بچے گا میں اس میں کچھ حصہ پڑھ دوں گا، پہلا عنوان یہ ہے کہ مستشرقین سے ہمیں گلہ کیوں ہو ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ☆ کہ با من انچہ کرد آں آشنا کرد

یعنی ہم نے جب سے تحقیق کے میدان کو چھوڑا اور اس کو یہ کہہ کر مستشرقین کے سپرد کر دیا کہ تم آؤ اس میدان میں، اس کے بعد نتیجہ ظاہر تھا، اس سلسلہ میں ہم کو مستشرقین سے کیا شکایت ہو سکتی ہے، لیکن اس سے زیادہ شکایت ہم کو اپنے سے کرنا چاہیے، مستشرقین کے انداز بیان کا اگر مطالعہ کیا جائے، تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں عیسائیوں کو مسلمانوں سے زیادہ خطرات ہوئے، اس وقت ان کے اعتراضات کی شدت بڑھ گئی اور جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کو خطرہ نہیں رہا تو ان کے اعتراضات میں کچھ کمی آئی، یہ اتار چڑھاؤ برابر ہوتا رہا، اس آخری دور میں مستشرقین نے ایک خاص روش اختیار کی ہے، جس میں وہ کھل کر اور شدت کے ساتھ مخالفت نہیں کرتے، بلکہ سلیقہ اور قرینہ سے وہ اعتراضات کرتے ہیں جو بعد میں خلش و خلفشار کے باعث ہوتے ہیں، مستشرقین کے پہلے ادوار اور اس دور میں یہ بھی فرق ہے کہ پہلے ان کے مخاطب زیادہ تر اہل یورپ اور اہل عالم ہوتے تھے، اب ان کا روئے سخن اہل اسلام کی طرف ہے اور ان کی کوشش یہ ہے کہ اب مسلمان راسخ العقیدہ نہ رہیں، بلکہ وہ

شبہات سے دوچار ہو جائیں، یہ سمت کا فرق ایک اہم بات ہے، جس کی طرف میں توجہ دلاؤں گا، ہندوستان میں ہماری ملت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، ایک تو وہ ہے جو دین کا پاسبان ہے، دوسرا وہ ہے جو جدید تعلیم سے واقف ہے، ملت کی یہ تقسیم خطرہ کا نشان ہے اور اگر ہم نے اپنے ان طلبہ اور ان بچوں کو جو جدید تعلیم پاتے ہیں، ان کے دین اور ان کی تہذیب سے واقف نہ کرایا تو مستشرقین کے خلاف ہماری کوشش کامیاب نہ ہوسکیں گی، میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ مستشرقین کے عناد اور ان کی ریشہ دوانیوں کے خلاف ہمارا ردعمل ہمیشہ جذباتی ہوتا ہے، ہم تدبر اور سنجیدگی سے کام نہیں لیتے، ہم یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے بڑی اسلام دشمنی کی ہے لیکن کبھی سنجیدگی سے یہ نہیں سوچتے کہ جتنی محنت انہوں نے کی ہے اس کا سواں حصہ بھی ہم من حیث القوم کرتے اور ہماری کتابیں بھی چھائی ہوئی رہتیں، تو ہم کو مستشرقین سے شکایت نہ ہوتی، ہم نے جو کچھ کام کیا ہے اس کو انگریزی زبان میں منتقل کرنا ضروری ہے، کیوں کہ انگریزی زبان عالمی زبان ہوگئی ہے، بہت کچھ جو ہم کر رہے ہیں یا جو قابل قدر تحقیقی کام کیے ہیں، ان میں بہت کم ایسے ہیں جو انگریزی یا یورپ کی زبانوں میں منتقل ہوئے ہوں، میں نے یہ بھی عرض کیا ہے اور اس میں میں مولانا ابواللیث صاحب سے متفق ہوں کہ اقوال سے زیادہ اعمال کے ذریعہ موثر تردید ہوتی ہے، اس کی مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں، مستشرقین جب تک مسلمانوں سے دور رہے، ان کے عناد میں شدت رہی اور جب وہ مسلمانوں کے قریب آئے تو مسلمانوں کے بارہ میں ان کا رویہ بدلنا شروع ہوا، اس کے بہت سے شواہد ہیں، شاعری میں ایک صنف ہے تضمین اور اقبال نے غنی کاشمیری کے ایک شعر پر تضمین کی ہے جو غالباً اردو زبان کی سب سے بہتر تضمین ہے، میں اس کے چند اشعار پیش کرتا ہوں:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے ☆ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ

اس کے بعد اقبال نے بتایا ہے کہ ہم جہاں بیں وہ جہاں بان و جہاں آرا تھے، اسلام کی عظمت کا ذکر کیا ہے، پھر وہ کہتے ہیں ؎

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شی تھی ☆ نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی ☆ جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن   کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

گویا اہل فرنگ نے ہماری دولت، سطوت اور اقتدار تو چھینا ہی تھا، ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ یعنی ہمارے علوم بھی چھین لیے، کتابوں سے مراد علوم ہی نہیں وہ زاویۂ نگاہ بھی ہے جو علم کا سرچشمہ ہے، ہم سے وہ زاویۂ نگاہ چھین لیا، ہم سے جستجو اور آرزو چھین لی، ہم سے وہ جذبہ چھین لیا جو حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لیے بے تاب رہتا ہے جو علم کے وسیلہ سے کائنات کو تسخیر کرتا ہے، جو انسان کے ذہنی افق کو بے کراں اور اس کے حوصلہ کو فلک شگاف بنا دیتا ہے، کتابیں ہاتھ سے کیا گئیں، آفاق کی قیادت، ہاتھ سے چھن گئی، پیش رفت کا اسم اعظم حافظہ سے محو ہو گیا جو صاحب ایجاد تھے، زندانِ تقلید بن گئے، جو عہد آفریں تھے، وہ عہدی بن گئے، ہماری کاہلی اور ہماری جہالت نے یہ دن دکھایا کہ ہمارے علوم وفنون، ہماری ادبیات، ہماری تاریخ وجغرافیہ سب اغیار کے ہاتھوں میں چلے گئے، ان سب کے لیے ہم دست نگر ہو گئے، چنانچہ ہم اپنی تہذیب اور اپنی میراث کو مغرب کی نگاہ سے دیکھنے لگے، اب ہم شکوہ سنج ہیں کہ اہل مغرب نے اپنی کتابوں میں ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا، مستشرقین کا رویہ ہمارے ساتھ غیر منصفانہ اور معاندانہ رہا ہے، کوئی ہمیں بتاتا کہ ع

اے بادصبا این ہمہ آوردۂ تست

اقبال ہماری نادر کتابوں کو یورپ میں دیکھ کر درد سے تڑپ اٹھا، اس میں ہماری علمی افلاس کی داستان عبرت پڑھی، یورپ کو مشعل علم سونپ کر ہم جہالت کے نہاں خانوں میں چھپ گئے، گویا ایک فرض تھا جس کو ہم ادا کر چکے، ایک بوجھ تھا جس کو اتار چکے، اپنی پشت سے ہم نے علم کا پشتارہ پھینک کر دم لیا اور اب ہم شکایت کرتے ہیں کہ مستشرقین نے ہماری اس طرح حق تلفی کی، ہمارے ساتھ یہ ظلم کیا، علم اور تحقیق، ریاضت اور جستجو سے کنارہ کش ہو کر ہم ہی نے تو انہیں دعوت دی تھی کہ ہم چلے، اب سیاہ سفید تمہارے ہاتھ میں ہے، اب اگر انہوں نے ہمارے نامۂ اعمال کو سیاہ کر دیا تو حیرت کیا؟ شکایت کیوں؟ قدرت خلا کو گوارا نہیں کرتی، چنانچہ علم کو جب ہم نے چھوڑا، تحقیق سے جب ہم نے منہ موڑا تو اہل مغرب نے اس خلا کو پر کیا، اب ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ ہمارے ساتھ انصاف کریں گے، ایک خیال خام ہے، ان کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ ہمارے دین، ہماری تاریخ اور تہذیب کو اسی زاویۂ نگاہ سے

دیکھیں جس سے ہم دیکھتے ہیں، ایسی بات کی امید کرنا ہے جو ناممکن ہو، نارمل ڈینیل نے اپنی کتاب ''اسلام اور مغرب'' تاثرات کی تشکیل میں اسلام کے متعلق مغرب کے رویہ، احساسات، ردعمل اور نگارشات کا جائزہ لیا ہے، کتاب کے آغاز میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، نقل کفر کفر نہ باشد، گویا یہ بیش تر مستشرقین کے طرز عناد کا اعتذار ہے، اس سے اس کی نیت کا اندازہ ہوتا ہے، فاضل مصنف کہتا ہے کہ جب تک اسلام ایک بڑھتی اور چڑھتی ہوئی طاقت تھا، اس وقت تک مغرب کے عیسائی اس کو اپنے مذہب کے لیے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتے تھے، اس وقت وہ مسیحیت کی دفاع کے لیے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف زہر اگلتے رہے، انہوں نے ٹھان لیا تھا کہ اسلام کے چہرہ کو داستانوں، روایتوں اور افواہوں کے سہارے کتابوں میں اس قدر مسخ کر کے پیش کیا جائے کہ اہل یورپ کو رغبت کے بہ جائے اس سے کراہت ہونے لگے، چنانچہ انہوں نے اسلام کا رشتہ بت پرستی سے جوڑنے میں بھی تامل نہ کیا اور سارا یورپ مسلمانوں کو بت پرست سمجھنے لگا، ستم بالائے ستم اس دین کو جو فرد کی مسئولیت سادگی، فقر و ریاضت، راستی اور عبادت پر اس قدر زور دیتا ہے، انہوں نے ہوسناکی اور عیش پرستی کا مجموعہ قرار دیا، مسلمانوں کی تعریف بھی اگر کبھی کی تو عیسائیوں کو غیرت دلانے کے لیے، یعنی مسلمان جو گمراہ اور سیہ کار ہیں، وہ تم زوال آمادہ عیسائیوں سے بہتر ہیں، ڈینیل صاحب کا یہ تجزیہ بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں کے متعلق یورپین رائے عامہ کو کسی قدر درست کرنے میں ان اکابر کا بھی دخل ہے جو مسیحی اور صلیبی جنگوں میں ان سے ٹکرائے، ان میں سرفہرست نام صلاح الدین ایوبی کا ہے، جن کا نام صلادین بن کر یورپ کے گھر گھر پہنچ گیا، صلاح الدین کی شجاعت، انصاف، رحم دلی، فراخ دلی، رافت و لطف نے انہیں یورپ میں بھی ہیرو کے منصب پر فائز کیا، کسی یورپین بادشاہ کو وہ عام مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، حالاں کہ انہوں نے عیسائیوں کو شکست فاش دی تھی، یہ بات عبرت ناک بھی ہے اور دل چسپ بھی کہ مسلمانوں کے اقبال کے دور میں یہودی اور عیسائی اس بات سے تقویت و توانائی حاصل کرتے تھے کہ کلام مجید میں ان کے مذاہب کا ذکر ہے، وہ ان کا دور مرعوبیت تھا، رابرٹ نے لکھا ہے کہ اگرچہ شریعت اسلامی بہت سے مقامات پر تبسم خیز ہے، مبصرین کو اس میں ہمارے مسیحی مذہب کے منشور کی تقدیس اور فضیلت کی سب سے بڑی شہادت اور سب سے مضبوط بنیاد ملتی ہے۔

سید حامد صاحب کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، ظفر اسحاق انصاری صاحب نے کہا کہ سید سلمان ندوی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، دارالمصنفین اور یہ جگہ ان کا اپنا گھر ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے آپ خلف رشید ہیں اور جنوبی افریقہ میں اسلامی علوم وتاریخ کے استاذ ہیں۔

ڈاکٹر سید سلمان ندوی : ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے حمد وصلوٰۃ کے بعد اپنی تقریر کا آغاز کیا اور کہا کہ امیر مینائی کا ایک بہت مشہور شعر ہے۔

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے ☆ پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

سید حامد صاحب نے ابھی اپنا مقالہ پڑھا، ان کے خیالات اور میرے خیالات خاصے ملے ہوئے ہیں لیکن (مزاحاً) ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے بالکل پوچھا نہیں ہے، ہماری غربت وافلاس کا آج یہ عالم ہے کہ ہمارے مسلم طلبہ ایوروز کو تو جانتے ہیں، ابن رشد کو نہیں جانتے، ادی سینا کو جانتے ہیں، ابن سینا کو نہیں جانتے، رازز کو جانتے ہیں، رازی کو نہیں جانتے، حد یہ ہے ہمارے افلاس کی کہ جبرالٹر کو جانتے ہیں، جبل الطارق کو نہیں جانتے، یہ وہ مثالیں ہیں کہ جن سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو تعلیم ہم نے حاصل کی وہ کہاں سے حاصل کی اور وہ کس رخ پر لے جارہی ہے، ۱۹۶۷ء میں جب میں شکاگو یونیورسٹی میں تھا اور وہاں تاریخ اسلام کا کورس لیا تھا تو اس وقت وہاں کی بہت مشہور مستشرقہ پروفیسر بنپا ایبوٹ تھیں، وہ بہت سی کتابوں کی مصنفہ ہیں، ان کی کتاب ''عائشہ دی بیلوڈ آف پرافٹ'' بہت مشہور ہے لیکن ان کی معرکۃ الآرا تصنیف ''نارتھ عربک اسکرپٹ'' ہے اور جس طرح مستشرق شاخت کا جواب فؤاد سزگین نے دیا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر ظفر اسحاق نے بتایا، اسی طرح بنپا ایبوٹ نے نارتھ عربک اسکرپٹ کی دوسری جلد میں شاخت کا بہت مدلل جواب دیا ہے، ع

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

یہ صنم خانے سے تو ملے، کعبہ سے نہیں ملے، وہ میرے والد مرحوم سے بھی واقف تھیں، میرے والد صاحبؒ سے ان کا ایک علمی مناظرہ اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن کے رسالہ میں ہوا تھا، یہ مناظرہ لفظ ہمایونی پر تھا، یعنی ہمایونی کا مطلب رائل ہے، یا اس کا مطلب خود بادشاہ ہمایوں سے ہے، انہوں نے

مجھے ایک مضمون لکھنے کے لیے دیا، جس کا عنوان تھا، ''اسلام اور مسیحیت دو بہنیں ہیں'' اس میں میں نے یہ لکھا کہ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ دونوں کا منبع ایک ہے تو بس کافی ہے، مشابہت یہیں ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد جو اختلافات اور بنیادی فرق تھے میں نے ان کو ظاہر کر کے ان کو پیش کیا، تو ان کا ریمارک یہ تھا کہ میں اپنے مذہب کا دفاع کرنا چاہتا ہوں، مطلب یہ تھا کہ میں اگر آبجیکٹیو یعنی معروضی ہوں تو پھر مجھے کچھ تنقید بھی کرنی چاہیے، واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اور جو علمی محنتیں کی ہیں، ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے لیکن اس کا یہ مطلب کہ کوئی ہمارے گھر پڑاکے پر ڈاکہ ڈالے رہے اور ہم اسے احسان سمجھتے ہوئے اپنا سر جھکاتے رہیں، مستشرقین کے درجات ہیں مشنریاں ہیں، پادری ہیں اور دوسرے لوگ ہیں، درجہ بدرجہ یہ لوگ مختلف دور میں بدلتے رہے اور اب اور آج سے چند سال قبل مستشرقین سول سروس میں بھی موجود تھے، جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی حکومت کو بتائیں کہ کس قوم سے ان کا واسطہ ہے، یہ حکومت کو اطلاع بہم پہنچاتے اور مشورہ دیتے رہے کہ کس طرح ان سے نپٹا جائے، ایران کے واقعہ کے بعد صدر کارٹر نے مستشرقین اور چند مسلم مصنفین اور اسکالرز کو جو امریکہ میں تھے، دعوت دی اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ میں ان کی ایک کمیٹی بنائی، جس نے ان کو یہ مشورے دیے کہ ایران کو کس طرح کمزور کیا جا سکتا ہے، یہ فریاد بے کار ہے اور یہ شکوہ بے سود ہے کہ کس مستشرق نے کیا لکھا اور کیوں لکھا، اگر وہ نہ لکھتے تو مستشرق ہی کیوں کہلاتے، ان کا انداز بدل گیا، اس وقت سب سے زیادہ ہمدرد مستشرق مونٹگمری واٹ ہیں، جن کو آج عالم اسلام میں مقبولیت حاصل ہے اور میں انتہائی تکلیف و الم کے ساتھ کہتا ہوں کہ مسلم ریاستوں کی سیرت کانفرنسوں میں ان کو دعوت دی جاتی ہے، پاکستان کی سیرت کانفرنس میں بھی وہ بلائے گئے اور ابھی چند ماہ ہوئے جب میں کراچی میں تھا تو ایک اور مستشرق کو دعوت دی گئی، ٹی وی پر ان کا انٹرویو لیا گیا، جن لوگوں نے ان سے انٹرویو لیا وہ اور بھی زیادہ غریب الفہم اور غریب الفکر تھے، وہ ان سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق رائے پوچھ رہے تھے، رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی شہادت ان سے چاہتے تھے، مونٹگمری کی کوئی کتاب بھی آپ پڑھیں وہ طنز سے خالی نہیں، ان کی ایک کتاب جس کو عالم اسلام میں بڑی ہمدردی سے دیکھا گیا اور جس کی بنا پر یہ سمجھا گیا کہ وہ اسلام کے ہمدرد ہیں، اس سے ایک اقتباس سنیے جس میں وہ عجیب کش مکش میں مبتلا ہیں، ع

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

وہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطا و نسیان ہوئے، مگر وہ قصداً نہیں تھے، آپ ان کو معاف کر دیجیے کہ یہ غلطیاں ہوا کرتی ہیں، دوسرے اقتباس کا مطلب یہ ہے کہ "آپ اگر رسول اللہ کی حیات کو دیکھیں تو ان کے اپنے عہد کے مطابق ان کی زندگی بڑی اچھی اور صاف ستھری تھی لیکن ہاں آج کل کے معیار سے ان کی ذات ویسی اعلا نہیں سمجھی جا سکتی ہے" جو کچا ذہن ہے وہ ایسی باتیں کسی نقد کے بغیر قبول کر لیتا ہے، میں ایک دوسری چیز کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس کا رونا ہمیں ہے اور بقول سید حامد صاحب ہماری فریاد اپنے آپ سے ہے، مسلمان اسکالر، پروفیسر، ٹیچر جو اس وقت یورپ، امریکہ اور افریقہ میں ہیں جب یہ چاہتے ہیں کہ نصاب میں ایسی کتابوں کو داخل کریں، جن کو مسلمان مصنفین نے لکھا ہو، تو حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں، ابھی تک سب سے مشہور کتاب جو عام طور سے پیش کی جاتی ہے وہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی "انٹروڈکشن ٹو اسلام" ہے محمد علی لاہوری کی بھی ایک کتاب ہے، ایک کتاب فیاض محمود کی شائع ہوئی ہے، مستشرقین کا رونا نہیں ہے، ؏

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

ہمارے پاس اس وقت جو سرمایہ اردو میں ہے وہ بڑا کافی سرمایہ ہے، ان سے مستشرقین کے جوابات دیے جاتے رہے، مگر آج کی علمی زبان انگریزی ہے، آپ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں، اس وقت اردو زبان کے ذخیرہ سے ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن اس وقت ہماری لڑائی ہندوستان پاکستان میں نہیں ہے، لڑائی اس وقت یورپ اور امریکہ میں لڑی جارہی ہے، اس لیے میں یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ دار المصنفین، ندوۃ المصنفین یا اسی قسم کے دیگر ادارے اپنی تمام کتابوں کو انگریزی میں منتقل کرنے کا ایک مستقل پروگرام اور ایک جامع منصوبہ تیار کریں اور اس کے لیے خاطر خواہ آدمی مقرر کریں، جن کی انگریزی بہتر سے بہتر ہو، بہت زمانہ ہوا، مولانا شبلیؒ نے ندوہ کے مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ندوہ نے ایک سید سلیمان پیدا کیا، بہت کیا، میں کہنا چاہتا ہوں کہ دار المصنفین نے اب تک جو خدمات انجام دی ہیں وہ بہت قیمتی ہیں، میرا خیال ہے، کہ وہ اپنا رول کچھ بدلے، وہ اپنی کتابوں کو انگریزی میں منتقل کرے، حضرۃ الاستاذ مولانا علی میاں کی کچھ کتابیں انگریزی

میں منتقل ہوئیں، جن سے ہم کو کچھ سہارا ملا، ہمارے یہاں مستقل ایک کورس ہے، اسلامک پرسنالٹیز پر لیکن اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں، تاریخ دعوت وعزیمت کا انگریزی ترجمہ ہوا، تو وہ بہت کام آئی، مطلب یہ ہے کہ ترجمہ کرکے اس کے لیے باقاعدہ پریس قائم کیے جائیں، طباعت اور اس کی نکاسی کا بھی پورا انتظام ہو، دوسری تجویز یہ ہے کہ ٹیکسٹ بک اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک کی تیار ہوں تاکہ یہ یورپ اور امریکہ جائیں تو ہم ان سے فائدہ اٹھاسکیں، یہ فریاد وشکوہ چھوڑ دیں، خود جو کرنا ہے کریں۔

ڈاکٹر سلمان ندوی کی اس تقریر کے بعد خاکسار نے چند باتیں عرض کیں، ابھی دارالمصنفین کا ذکر ہمارے بھائی ڈاکٹر سلمان ندوی نے کیا، جس میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ دارالمصنفین کی ساری کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا جائے، دارالمصنفین نے سیرت اور علوم اسلامیہ پر جتنا کام کیا ہے، اس پر اس کو فخر ہے، اگر آپ اجازت دیں تو کہوں کہ ایک بار ڈاکٹر اقبالؒ اور سید صاحبؒ کی گفتگو افغانستان کے سفر میں ہوئی، تو سید صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحبؒ سے یہ فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب! جب تک آپ کی شاعری ہندوستان میں پڑھی جائے گی، اس وقت تک اسلام ہندوستان میں زندہ رہے گا، ڈاکٹر صاحبؒ نے بڑے عجز وانکسار سے فرمایا کہ نہیں جب تک علامہ شبلیؒ اور دارالمصنفین کی کتابیں ہندوستان میں باقی رہیں گی، ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا، اس موقع پر سر راس مسعود بھی موجود تھے، انھوں نے کہا کہ آپ حضرات اس معاملہ میں اختلاف کیوں کرتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور مولانا شبلیؒ اور دارالمصنفین کا لٹریچر جب تک ہندوستان میں باقی رہے گا، ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا، یہاں سے سیرت پر سات جلدیں شائع ہوئی ہیں، صحابہ کرامؓ پر بارہ جلدیں لکھی گئی ہیں، تاریخ اسلام پر بھی بارہ جلدیں مرتب ہوئی، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اسلام، محدثین اسلام، صوفیائے اسلام اور حکمائے اسلام پر بھی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں لیکن اب ہم سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ ہندی میں کردو، ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کو منتقل کردو، ابھی عرب سے جو فضلا تشریف لائے ہیں، وہ ہماری علمی نمائش دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے تو میں نے ذکر کیا کہ سیرت کا ترجمہ ترکی، فارسی، تامل اور گجراتی میں ہوچکا ہے، یہ سن کر انھوں نے جب یہ فرمایا کہ عربی ہی ایسی مظلوم زبان تھی جس میں اب تک سیرت کا ترجمہ نہیں ہوسکا ہے، تو میری گردن

ندامت سے ضرور جھک گئی، میں نے عرض کیا کہ سیرت کا عربی ترجمہ اسماعیل ندوی مرحوم نے کیا ہے، لیکن وہ اب تک شائع نہیں ہوسکا ہے، دارالمصنفین کو جولٹریچر ایک خاص مقصد کے تحت پیش کرنا تھا وہ کر چکا، اب ہم کو توقع یہ ہے کہ جو کتابیں جن لوگوں کو پسند ہیں، کیا وہ ان کے ترجمے کے لیے آگے نہیں بڑھ سکتے، ہم تو ڈاکٹر سلمان ندوی سے یہ کہتے ہیں کہ تم کو مواقع میسر ہیں، ہم تو اپنے محدود ذرائع یا کسی اور وجہ سے اپنے کام کا پھیلاؤ نہیں کر سکتے، ڈاکٹر سلمان ندوی اور ان کے جیسے دوسرے دانش ور اپنے ذمہ یہ کام لے لیں کہ دارالمصنفین کی جو کتاب ان کو پسند ہو اس کو وہ انگریزی زبان یا کسی بھی زبان میں ترجمہ کردیں، سارا بار ہم پر کیوں ڈالا جائے، ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی کرو وہ بھی کرو لیکن یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ ہمارے ذرائع کتنے ہیں، اگر سب کام ہم اپنے ذمہ لے لیں تو جو اصل کام ہے وہ بھی جاتا رہے گا، اس وقت دنیا کے نام ور علما موجود ہیں، ان کو میں یہی دعوت دیتا ہوں، کراچی کی سیرت کانگریس میں یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ سیرۃ النبیؐ کے ترجمے مختلف زبانوں میں کردیے جائیں اور میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں، سیرت پر شاید کسی دوسری زبان میں اتنی مکمل اور جامع کتاب شایع نہیں ہوئی، ہمیں توقع یہ تھی کہ جو دوسری زبانوں کے جاننے والے ہیں وہ ہمارا بوجھ ہلکا کریں گے، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم نہ تو رائلٹی لیں گے نہ کوئی دوسرا مطالبہ کریں گے، ہمارا تو مشن یہ ہے کہ اسلام کا پیغام دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچے، اگر وہ یہ کام اپنے ذمہ لے لیں، تو ہم ان کے بڑے ممنون ہوں گے۔

خاک سار کے ان معروضات کے بعد جناب عبدالصبور مرزوق کو دعوت دی گئی، اس موقع پر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا کہ ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق رابطۂ عالم اسلامی کے ڈائرکٹر جنرل ہیں اور آج ہی یوگنڈہ سے تشریف لائے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق: ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق نے رابطۂ عالم اسلامی کے مکمل تعاون کا ذکر کیا انھوں نے بتلایا کہ سیرت النبیؐ کا انگریزی ترجمہ رابطہ کی جانب سے بہت جلد شائع ہونے والا ہے، سیرت کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب ''السیرۃ النبویۃ فی القرآن'' کا ذکر کیا، رابطہ کے سلسلۂ دعوۃ الحق کی بعض کتابوں کا بھی ذکر کیا، اس سلسلہ نے ایک رسالہ الرسول فی کتابات المستشرقین یعنی سیرۃ رسول مستشرقین کی تحریروں میں، کا ذکر خصوصیت سے کیا، مگر اس

کے ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ سب انفرادی کوششیں ہیں، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ اسلام کو نئے سرے سے لکھا جائے اور سیرت پر جو کتابیں موجود ہیں انھیں نئے اسلوب اور نئے طرز پر مرتب کیا جائے اور کوشش یہ رہے کہ سیرت کے مثبت پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوسکیں، انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے مسلم طلبہ اب اسلامی علوم میں تخصص کے لیے یورپ کا رخ نہ کریں، خود ہماری عرب یا اسلامی یونیورسٹیاں خود کفیل ہوں اور اسلامی علوم وفنون میں طالب علم کو یہ ضرورت محسوس نہ ہو کہ وہ یورپ جائے اور وہاں علم حاصل کرے، ایک بات ڈاکٹر صاحب نے بہت اہم کہی کہ مستشرقین نے جن کتابوں کو بہ طور مراجع پیش کیا ہے ان کا بھی جائزہ لیا جائے کیوں کہ مستشرقین مراجع میں بھی تحریف سے کام لیتے ہیں، لہٰذا بڑی حد تک ان مستشرقین کے پیدا کردہ اشکالات، شبہات اور اعتراضات کا رد خود ان کے مراجع کے ذریعہ ہی مل جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا کہ سیرت النبیؐ کا عربی ترجمہ تیار ہے، اور میری گفتگو اس سلسلہ میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی اور ان کے دوستوں سے ہوئی ہے، قطر میں سیرت کے ایک بین الاقوامی اجتماع میں یہ طے ہوا تھا کہ اس سلسلہ میں ایک مستقل سکریٹریٹ الامانۃ العامۃ قائم کیا جائے، یہ سکریٹریٹ اس بات کا خواہش مند ہے کہ وہ سیرت النبیؐ کا عربی ترجمہ شائع کرے، میں نے اس سلسلہ میں نشان دہی کی تھی، کہ اس کے دو حصوں کا ترجمہ ڈاکٹر اسماعیل ندوی نے کیا تھا، پہلا حصہ غالباً شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری کے پاس پہنچ چکا ہے، یا عبدالحلیم محمد احمد کے پاس ہے جو بڑے ناشر ہیں، میری ہی نشان دہی پر انھوں نے وہ نسخہ حاصل کرلیا تھا، افسوس ہے کہ ڈاکٹر اسماعیل ندوی کے اچانک انتقال کی وجہ سے اس کے دوسرے حصہ کا سراغ نہیں مل رہا ہے، وہ ترجمہ مکمل کرچکے تھے، سید صاحبؒ کی سیرت عائشہؓ کا ترجمہ میرے فاضل دوست مولانا ناظم ندوی نے عرصہ ہوا کرلیا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے، میرا مشورہ تھا کہ اسے کسی عرب ناشر کو دے دیا جائے وہ اسے شائع کردے اور وہاں سے بآسانی اہل علم کے پاس پہنچ جائے لیکن ہمارے فاضل دوست سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی خواہش یہ ہے کہ وہ دارالمصنفین کی مطبوعات کے سلسلے میں شامل ہو اور وہ ندوہ کے پریس میں چھپے، ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اس کا اعلان کیا ہے اور وہ یہ اعلان

کرنے کی پوزیشن میں ہیں کہ اس سلسلے میں رابطہ کی طرف سے جو بھی تعاون ممکن اور مفید ہو، اس کے لیے وہ تیار ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ان کلمات کے بعد جناب خواجہ احمد فاروقی کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، ان کے مقالہ کا عنوان تھا ''مستشرقین کے تصور اسلام کا تاریخی پس منظر'' لیکن تاخیر زیادہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے مقالہ پیش نہیں کیا اور اخیر میں صدر جلسہ جناب حکیم محمد سعید دہلوی نے صدارتی کلمات ادا فرمائے۔

حکیم محمد سعید: حکیم صاحب نے فرمایا کہ مجھے ان کا بہ خوبی احساس ہے کہ تاخیر بہت ہو چکی ہے اور اس نشست کو جلد از جلد ختم کرنا چاہیے، لیکن میرا یہ خوشگوار فرض ہے کہ آج کی مجلس کے مقررین کا بصمیم قلب شکریہ ادا کروں، کہ انھوں نے نہایت اہم نکات کی طرف اس موتمر کو متوجہ کیا ہے اور شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان مقالہ نگار حضرات کا جنھوں نے تاخیر کے سبب اس وقت مقالہ نہ پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے اور شکریہ ادا کرنا چاہیے ان مترجمین کا جنھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اس فرض کو انجام دیا، میں نے اس موتمر میں التزام سے شرکت کی ہے اور تمام مقالات غور سے سنے ہیں اور مسئلہ مستشرقین اور مسئلہ مستغربین پر احتیاط سے غور کیا ہے، اس موتمر کا رجحان بالعموم یہی رہا ہے کہ مستشرقین نے جو اچھائیاں کی ہیں، ان کا اعتراف کیا جائے اور انھوں نے جو قصداً یا شرارتاً غلطیاں کی ہیں، ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے، میری رائے اس معاملہ میں یہی ہے کہ اس میدان میں ہمیں قدم بڑی احتیاط سے بڑھانا چاہئے، نہ یہ مناسب ہے کہ ہم لڑائی مول لیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ خاموشی اختیار کریں، اس میدان میں میری اپنی رائے یہ ہے کہ اس موتمر کو اختتام سے قبل کسی حتمی نتیجہ پر پہونچنا ہے، مجھے توقع ہے، بلکہ یقین ہے کہ اس موتمر کے منتظمین ان نکات اور ان رموز کو نوٹ کر رہے ہوں گے جن کو بالآخر تجاویز کی شکل دی جا سکے، کیوں کہ اگر ہم نے تجاویز مرتب نہ کیں اور لائحۂ عمل مرتب نہ کیا تو یہ خیال ہے کہ اس اہم موتمر سے وہ نتائج حاصل نہ ہو سکیں گے، جس کے لیے ہم نے عزم و ارادہ کیا ہے، اس سلسلے میں میری ایک تجویز یہ ہے کہ ہمیں اس موتمر کو ایک مستقل شکل دینی چاہیے، یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ کانفرنس ہر سال اعظم گڑھ ہی میں ہو، اور دارالمصنفین پر اس کا بار پڑے، یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے ممالک بھی اس

معاملہ میں پیش قدمی کریں اور اس کانفرنس میں یہ طے کرلیں کہ آئندہ کانفرنس اگلے سال کس ملک میں ہوگی، جب تک ہم اس کام کو مستقل اور مرکزی حیثیت نہ دیں گے، یہ کام خوش اسلوبی سے آئندہ انجام نہ پاسکے گا۔

جناب حکیم محمد سعید صاحب کے ان خیالات کے بعد ہی مندوبین حضرات نے کانفرنس کے آئندہ انعقاد سے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا، خود حکیم صاحب کی تجویز تھی کہ یہ کانفرنس ہر سال منعقد ہو، بعد میں جناب یوسف قرضاوی صاحب نے قطر کی طرف سے پیش کش کی کہ وہاں کے شریعت کالج اور مرکز السنہ والسیرۃ کی طرف سے اگلی بار اس کی مہمان نوازی کے فرائض انجام دیے جائیں گے لیکن ان کی تجویز یہ تھی کہ اس قسم کے سمینار ہر سال کے بہ جائے ہر دوسرے سال پر منعقد ہوں، تاکہ اچھی طرح سے تیاری کرلی جائے، یہ سمینار پہلا تجربہ ہے اور پہلے تجربہ میں عموماً کوتاہیاں رہ جاتی ہیں، تیاری پوری طرح نہیں ہوپاتی، اگلی بار اس کا اہتمام کیا جائے کہ لوگوں کو سمینار کے انعقاد سے کافی قبل موضوعات دے دیے جائیں، تاکہ وہ سمینار زیادہ مفید نتائج کا حامل ہو۔

اس موقع پر خاک سار نے عرض کیا کہ مجھے اس کی خوشی ہے کہ قطر میں اس کی دعوت دی گئی ہے، لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ دوسال کا وقفہ نہ دیا جائے، اس لیے کہ اس سمینار سے جو جذبات بیدار ہوئے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ دوسال کے بعد یہ کہیں سرد نہ پڑ جائیں، ویسے یہ میری ذاتی رائے ہے، میں آپ لوگوں کی رائے کا بھی طلب گار ہوں گا، کہ دوسال کے بعد یہ سمینار کرنا مناسب ہوگا یا ہر سال؟ اس کے بعد ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے اعلان کیا کہ اس سمینار کی ایک کمیٹی ہے جو ان تجاویز پر غور کررہی ہے اور اس کے بعد ان کو آخری شکل دے کر ان شاء اللہ کل سفارشات آپ کے سامنے پیش کرے گی، میری رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ پر مزید ہم کسی گفتگو میں وقت صرف نہ کریں۔

اس کے بعد حکیم محمد سعید صاحب نے فرمایا کہ میں جناب سید صباح الدین صاحب کی اس تجویز سے متعلق ہوں کہ یہ سمینار ہر سال کرنا چاہیے، بہر حال کمیٹی فیصلہ کرے گی اور امید ہے کہ اگلے سال یہ کانفرنس ان شاء اللہ پاکستان میں ہوگی لیکن پھر انھوں نے قطر میں اس کانفرنس کے پہلے انعقاد کو بھی پسند کیا، انھوں نے ایک اہم تجویز یہ بھی رکھی کہ اس سمینار کا ایک سکریٹریٹ یعنی ایک اساسی کمیٹی

ہونی چاہیے جس کا مرکز دارالمصنفین ہو۔

خاک سار نے اس موقع پر کہا کہ یہ میرے لیے فخر کی بات ہے کہ دارالمصنفین کو اس کا مرکز بنایا جارہا ہے لیکن میری گذارش یہ بھی ہے کہ اس موقع پر کمیٹی کے ممبروں کے نام بھی تجویز کر لیے جائیں، بہر حال یہ طے ہوا کہ سمینار کی کمیٹی ان سارے امور پر غور کر کے اپنی تجویز آئندہ نشست میں پیش کر دے گی۔

اس کے بعد یہ نشست ختم ہوگئی۔

سمینار کی پانچویں نشست رابطۂ عالم اسلامی مکہ کے ڈائرکٹر جنرل عبدالصبور مرزوق کی صدارت میں ہوئی، ان کی صدارت کی تحریک کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ایک بار پھر فرمایا کہ رابطۂ اسلامیہ نے خاص طور سے ان کو اپنا نمایندہ بنا کر اس سمینار کے لئے بھیجا ہے، وہ بہت ہی مشغول آدمی ہیں، اس وقت یوگنڈا سے یہاں کی شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں، کارروائی کو آگے بڑھانے کے فرایض ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے انجام دیے، انھوں نے جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی کو اپنا مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی، جس کا عنوان تھا ''مستشرقین کے تصور اسلام کا تاریخی پس منظر''۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی : اس مقالہ کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

مشرق کے خلاف یورپ کی جارحیت ہمہ جہت تھی، ان کے حملے صرف فوجوں کے ذریعہ نہیں ہوئے، اس میں ان کے دانش ور مستشرقین، اہل فکر، شعرا اور اساتذہ بھی شامل تھے، اسی لیے اقبالؒ نے مغربی مدرسوں کی کورنگاہی اور بے ذوقی کی شکایت کی ہے۔ ع

نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ

مغربی اثرات کے چیلنج کا ردعمل مشرق پر ایک دائرہ کی شکل میں رونما ہوا، جس میں ردوقبول تقلید وتخلیق، تنقیدی فکر اور بہترین اقدار کا انتخاب اور اعتماد کے ساتھ اپنی صالح مشرقیت پر جمے رہنے کا انداز کار فرما ہے لیکن مغرب نے نئے نئے دام بچھائے تھی اور ایک ایسی نسل کو تیار کیا تھا، جو اپنی ذہنیت اور مرعوبیت میں بالکل مغرب زدہ اور مشرق سے بیزار تھی، دراصل اہل کلیسا کا یہ نظامِ تعلیم اقبالؒ کے الفاظ میں ع

ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبالؒ نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک خط میں صراحت سے لکھا ہے کہ لندن میں مشرقی وافریقی علوم کا ادارہ صرف برطانوی سامراجیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے، اسی قسم کے خیالات انھوں نے حافظ فضل الرحمٰن انصاری کے نام ایک خط میں ظاہر کیے ہیں، لکھتے ہیں:

جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے، فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاق حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے، سادہ لوح مسلمان طالب علم طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔ (اقبال نامہ، ص۳۹۲)

اقبالؒ کو افسوس تھا کہ مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان روحانی اعتبار سے فرومایہ ہیں، ان کی نظر مساوات شکم سے آگے نہیں جاتی، وہ روح کو معدہ میں تلاش کرنا چاہتے ہیں، حالاں کہ روح کی قوت وحیات کا جسم سے کوئی تعلق نہیں، یہ اور اسی قسم کے بہت سے خیالات ان مغربی دانش وروں کے ذریعہ پھیلے جن کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیے بغیر ترقی ممکن نہیں تھی۔

جب اقوام مغرب نے مشرق کا بحری راستہ معلوم کیا اور مشرق پر اپنی حاکمیت قائم کرنا شروع کی تو اس کی ضرورت بھی محسوس کی کہ ان کی زبانوں کو، ان کے مذاہب کو اور ان کے تہذیب وتمدن کو سمجھیں اور ان کو اپنے رنگ میں اس طرح پیش کریں کہ مغرب مقابلۃً اعلا وارفع نظر آئے اور ان کی صنعت وحرفت اور سامان تجارت بہتر ٹھہرے، جن عالموں نے اس اقلیم میں قدم رکھا، وہ مستشرقین کہلائے اور پورا ایک نیا علم اورینٹلزم کے نام سے وجود میں آگیا، یہ مشرق اورینٹ (ایسٹ نہیں) اصل میں مغرب کا زائیدۂ فکر ہے، جہاں تخیل ہی تخیل ہے، رومانس ہی رومانس ہے، اس میں شدید جنسیت ہے، عیش وعشرت کی بہتات ہے، بھوک اور بے رحمی ہے، اس کی میزان قدر میں قرآن پاک اہم نہیں ہے، الف لیلہ اہم ہے، جو عربی ادبیت میں معمولی درجہ کی کتاب ہے، یہ مشرق ومغرب کی بنیادی تہذیب کا حصہ بن گیا ہے، اس میں عجیب وغریب آدمی رہتے ہیں، نیم وحشی، نیم متمدن، نیم برہنہ، خواجۂ سگ پرست بھی، نعمان سیاح بھی، زاہد بھی، رند بھی، اس مشرق کی دولت بکھراں ہے، اس کے خام پیداوار کے بغیر مغرب کے کارخانے نہیں چل سکتے، یہ مشرق تہذیب کا گہوارہ اور مذاہب کا سرچشمہ ہے، یہ مشرق مغرب کے مادی مفادات کا مرکز ومحور ہے، اس مشرق کو یورپ نے سماجیاتی، فوجی، جنگی اور سیاسی طور پر

پیدا کیا ہے اوراس موقع پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا کتب خانہ تیار ہوسکتا ہے، اس مشرق کا جو کلیۃً مغربی تصورات اور مفادات کی پیداوار ہے، کچھ تھوڑا سا اندازہ دانتے کی مشہور ومعروف نظم طربیہٴ خداوندی سے ہوسکتا ہے، جو ۱۳۱۴ء اور ۱۳۲۱ء کے درمیان تصنیف ہوئی، اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں اہل یورپ مشرق بالخصوص اسلام کے متعلق کیسے گھناؤنے تصورات رکھتے تھے اوران کا بس نہیں چلتا تھا، کہ عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دل سے نکال دیں، اس لیے کہ اسی پران کی عظمت قائم تھی، اس نظم نے یورپ کے ذہن وضمیر پر بے انتہا اثر ڈالا ہے اوراتنے ماہ وسال گذرنے کے بعداس میں تاریخ کی سی تقدیس اور سچائی پیدا ہوگئی ہے، طربیہٴ خداوندی کے تین حصے ہیں، دوزخ، برزخ اور فردوس، دانتے مشرق ومغرب کی اہم شخصیتوں سے واقف تھا، مثلاً وہ درجل، ہومز، ابن سینا، ابن رشد سے واقف ہے اور مسلمانوں اور یہودیوں کی تاریخ سے بھی ناآشنا نہیں تھا، اس میں عیسائیوں کی کورنگہی، تنگ دلی اور عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے، اس کا یہ ایمان ہے کہ مغفرت کے سزاوار صرف کیتھولک عیسائی اور باقی سب دوزخ کا کندہ ہیں، دانتے نے دوزخ کے کیٹو اٹھائیس اورنویں طبقہٴ جہنم یعنی اقلیم عذاب میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ بڑی ہی ہیبت ناک تصویر کھینچی ہے، نقل کفر کفر نہ باشد، یہ دکھلایا ہے کہ شکم مبارک چاک ہے اور حضور سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نعوذ باللہ آنتیں باہر لٹکی ہوئی ہیں، اوروہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جن کو خود نعوذ باللہ دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے، فرماتے ہیں: دیکھو میری یہ حالت سیاہ ترین بدمستیوں اور بدکاریوں کا نتیجہ ہے، یہ عیسائیت کو مسخ کرنے، فریب اور ریاکاری اور نفاق کو پھیلانے اوراختلاف کا بیج بونے کی سزا ہے، استغفر اللہ! دانتے کو پاپائیت اور کیتھولک فلسفہ اور عقیدے پر پورا یقین تھا اوراس کے تخیل کے سارے نقش ونگار اسی مذہبی تعصب کے پیدا کردہ ہیں، طربیہٴ خداوندی کی تعمیر وترکیب میں بھی یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی روایتوں، تمثیلوں اور یونانی، رومی اورعرب صنمیات کے علاوہ سب سے زیادہ دخل اس تعصب کو ہے جو صلیبی جنگوں سے عیسائیوں کے دلوں میں جاگزیں تھا اوراس میں سب سے بری کرشمہ سازی اس زہریلے تخیل کی ہے جو دانتے کی شاعری کا حصہ بن گیا تھا، اس کا اتنا گہرا اثر مغرب پر ہوا ہے کہ انھوں نے طربیہٴ خداوندی کو صحیفہٴ آسمانی شمار کرلیا تھا۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دانتے سے لے کر ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم میور اور بیسویں صدی کے مانٹ گمری واٹ تک اسلام کا کم و بیش یہی تصور سامنے رہا ہے، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان میں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسر آئے وہ بھی یہی تخیل رکھتے تھے اور وہ عیسائیت کی سب سے بڑی خدمت یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنائیں، ان کی عظمت دیرینہ کو ختم کر دیں اور ان کے دل سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نکال دیں، وہ خوب جانتے تھے کہ اس محبت کے بغیر اسلام کی عمارت ڈھ جائے گی، ۱۸۴۱ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو مناظرے پہلے آگرہ اور پھر دہلی میں ہوئے، ان میں بھی یہی تخیل اور یہی تعصب کارفرما ہے، ۱۸۰۳ء میں عیسائیوں نے دہلی میں قدم جمائے اور ۱۸۰۳ء ہی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے یہ فتویٰ دیا کہ ہگلی سے لے کر دہلی تک سارا علاقہ انگریزوں کے زیر اثر آ گیا ہے، اس لیے ان کے خلاف لڑنا ہمارا دینی فریضہ ہے لیکن اسی کے ساتھ ہمیں ان کے نئے علوم کو بھی سیکھنا چاہیے، ۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۰ء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی ڈاکٹر وزیر خاں اور یورنڈ فینڈر کے درمیان آگرہ میں جو مذہبی بحثیں اور مناظرے ہوئے ان سے بھی عیسائیوں کی یہی کورفہمی، تنگ نظری اور عصبیت جھلکتی ہے، جو صلیبی جنگوں اور دانتے کی بدولت ان کو وراثۃً ملی تھی، سر سیدؒ کا یہ خیال صحیح ہے کہ اسی کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں علما نے قلم چھوڑ کر تلوار اٹھالی تھی۔

۱۸۳۳ء میں جو چارٹر ایکٹ آیا، اس نے بھی مسیحی مبلغین کو بالکل بے لگام کر دیا تھا اور انھوں نے مسلمانوں کی دلشکنی اور دل آزاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، اس کی شہادت ڈپٹی نذیر احمدؒ اور سر سید کی تحریروں سے بہ خوبی مل جاتی ہے۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مشرق کے زوال اور مغربی استحصال کے ساتھ ساتھ اسلام اور اسلامی ممالک کی غلط تعبیر کے لیے ایک نیا ڈسپلن وجود میں آیا، جس کو اورینٹلزم کہا جاتا ہے، میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اس شر میں خیر بھی شامل تھا، اس سے بالواسطہ تحقیق کی نئی راہیں بھی کھلیں اور سماجی اور سائنسی علوم کی مدد سے پہلے کے مقابلہ میں زیادہ خزینہ دار اور تونگر بن گئیں، لیکن انیسویں صدی کے اواخر تک یہ کوشش صرف جھوٹی سچی روایتوں، افواہوں اور افسانہ طرازیوں اور

صحیح وموضوع حدیثوں کا مجموعہ تھی جس کے پیچھے سامراجی مقاصد تھے، ان مقاصد پر خوبصورت پردے پڑے ہوئے تھے اور عام طالب علم ان پردوں کے نقش ونگار ہی کو حقیقت سمجھ بیٹھے تھے، ڈاکٹر اسپرنگر کی کتابیں بزبان انگریزی وجرمن اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں، اس نے انگریزی میں لائف آف محمد کے نام سے لکھی جو الہ آباد سے ۱۸۵۱ء میں شائع ہوئی، پھر جرمن زبان میں لائف اینڈ وکٹریز آف محمد کے نام سے تین جلدیں لکھیں، جو ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئیں، اسپرنگر کا ماخذ واقدی ہے جس کے متعلق تمام دنیا یہ جانتی ہے کہ وہ اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا تھا اور اس کی غلط روایتوں، افسانہ طرازیوں اور جھوٹے قصے کہانیوں اور بے سند باتوں کی وجہ سے تمام علمائے اسلام نے غلط اور نامعتبر قرار دیا یہی حال سر ولیم میور کا ہے، جن کے اعتراضات سے سر سید کا کلیجہ چھلنی ہوگیا تھا اور اسی کا جواب لکھنے کے لیے وہ انگلستان گئے اور اس کا جواب انھوں نے خطبات احمدیہ کے نام سے ۱۸۷۰ء میں اپنے برتن بیچ کر لندن سے شائع کیا، سر ولیم میور نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں وہ تمام رکیک اور بے ہودہ الفاظ استعمال کیے ہیں جو اس سے قبل صلیبی جنگ اور دانتے کے ذریعہ رائج ہو چکے تھے، کارلائل اور گبن کے یہاں چند اچھے کلمات مل جاتے ہیں لیکن ان کی استثنائی حیثیت ہے اور صحیح معنوں میں وہ مستشرق نہیں ہیں، انیسویں اور بیسوی صدی کے اوائل تک حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کو مسیحی تعصب سے جانچا گیا اور اسلامی تاریخ کو مسخ کر کے اسکولوں اور کالجوں میں پیش کیا گیا، عیسائیوں نے مسلمانوں کی عظمت دیرینہ اور تہذیبی برتری پر کاری ضرب لگائی، اس لیے کہ بقول اسپرنگر جو قدیم دہلی کالج کا پرنسپل تھا، اسی عظمت کے احساس نے ان کو لکھنؤ اور دہلی کی مدافعت میں جو ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں عمل میں آئی، ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ موت سے آنکھ ملا سکیں اور بے پناہ اور ناقابل تسخیر بن جائیں، بیسویں صدی میں عیسائیوں کے ضمیر نے ایک نئی کروٹ لی، یا یہ پرانے شکاری ایک نیا جال لائے، یا تیل کی اہمیت کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے کچھ نرم کرنا چاہتے ہیں، بہر حال اسی وجہ سے علم کی خاطر کم اور سیاست کی وجہ سے زیادہ ووڈ بروک کالج سیلی اوک نے کرسچین مسلم ڈائیلاگ شروع کیا ہے، اس سے امید بندھتی ہے کہ تعصب کے پردے چاک ہوں گے، مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی کوشش سے ایک صحیح تصویر ابھرے گی۔

جناب سید اطہر حسین صاحب: اس مقالہ کے بعد جناب سید اطہر حسین صاحب آئی، اے، ایس کو اپنا مقالہ پیش کرنے کی زحمت دی گئی، وہ اتر پردیش کی حکومت میں اعلا ترین عہدوں پر رہ چکے ہیں اردو اور انگریزی میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، قرآن مجید اور حدیث پر ان کی اچھی نظر ہے، جس موضوع پر چاہتے ہیں بڑی بے تکلفی اور آسانی سے انگریزی اور اردو میں چھوٹے بڑے رسالے قلم بند کر لیتے ہیں، شاعر بھی ہیں، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے معزز رکن بھی ہیں، ان کے مقالہ کا موضوع ''قرآن اور مستشرقین'' تھا اردو اور انگریزی دونوں میں ان کا یہ مقالہ تھا، انگریزی میں ان کا یہ مقالہ چھپا ہوا تھا، جو لوگوں میں تقسیم کیا گیا، انھوں نے اپنا یہ مقالہ کچھ اردو اور کچھ انگریزی میں پڑھا، اس میں یہ دکھایا ہے کہ یورپ کے فضلا کلام پاک کے غلط سلط ترجمے کر کے کس طرح گمراہی پھیلاتے ہیں، خود یورپ کے بعض اہل نظر نے ان کی مذمت کی ہے، اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

جارج سیل نے انگریزی زبان میں سب سے پہلی بار قرآن کا ترجمہ ۱۷۳۴ء میں کیا، اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس سے قبل جو لاطینی زبان میں ترجمے تھے، ان میں اصل سے انحراف تھا، ببلی انڈر نے جو ۱۵۴۳ء میں لاطینی میں ترجمہ کیا، اس کو ترجمہ ہی نہیں کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس میں اتنی کثیر غلطیاں ہیں اور اتنی جسارت سے کام لیا گیا ہے اور اتنی چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے یا تبدیلی کی گئی ہے کہ اس کو اصل سے کوئی مطابقت یا مماثلت نہیں ہے،'' "Andred Arriuabene" کے لاطینی ترجمہ کے متعلق جارج سیل نے لکھا ہے کہ وہ اور بھی ناقص ہے اور جو ترجمہ Andrew du Ryer نے فرانسیسی زبان میں کیا ہے وہ کسی طرح ترجمہ کہلانے کے لائق نہیں، کیوں کہ اس کے ہر صفحہ پر بے شمار غلطیاں ہیں، جا بہ جا تحریف یا اضافے ہیں اور آیتوں کو مسخ کیا گیا ہے جو نا قابل معافی ہے، اسی فرانسیسی ترجمہ کو الکزنڈر روس نے انگریزی میں کیا، جس کے متعلق جارج سیل کی رائے ہے کہ وہ عربی زبان مطلق نہیں جانتا تھا اور نہ اس کو فرانسیسی زبان پر عبور تھا، اس نے اصل مترجم کی غلطیوں میں اپنی طرف سے اضافہ کیا اور بہت ہی مذموم زبان استعمال کر کے ترجمہ کو مضحکہ خیز بنا دیا Father Lewis Marraccl نے لاطینی زبان میں ۱۶۹۵ء میں ترجمہ کیا تھا، جس کے متعلق سیل نے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ اس ترجمہ و تفسیر میں تمام تر تکرار ہے، جس کی وجہ سے ضخامت بڑھ گئی ہے، مگر اتنا

ہی غیر اطمینان بخش ہے، کہیں کہیں زبان میں جسارت اور گستاخی سے کام لیا گیا ہے، خود اپنے ترجمہ کے متعلق سیل کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو ان ترجموں سے پیدا ہوگئی ہے، اس کا خیال تھا کہ پروٹسٹنٹ کامیابی کے ساتھ قرآن پر حملہ کر سکتے ہیں اور اس کو بھروسہ ہے کہ قدرت نے پروٹسٹنٹ کا بجا انتخاب کیا ہے کہ وہ قرآن کو شکست فاش دیدیں، اس نے اپنے پیش رو مترجمین اور مستشرقین کی مذمت کی، جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی یا قرآن عظیم پر بے بنیاد الزامات تراشے اور نہایت ہی قابلِ اعتراض زبان استعمال کی، مگر اپنی بے لوث کوشش اور فراخ دلی کے متعلق کہتا ہے کہ ''محمدؐ (نعوذ باللہ) کتنے ہی مجرم کیوں نہ ہوں کہ انھوں نے انسانیت پر ایک غلط مذہب تھوپا، مگر ان کی ذات وصفات سے انکار نہیں ہوسکتا ہے اور میں متقی اور لایق Spanhemius کو داد دیتا ہوں کہ ہر چند وہ سمجھتے تھے کہ وہ (یعنی محمدؐ) نعوذ باللہ ایک بدقماش جعل ساز تھے مگر انھیں بھی تسلیم ہے کہ قدرت نے ان کو یعنی محمدؐ کو تمام کمالات سے متصف کیا تھا، جس میں جسمانی خوبصورتی، لطیف زیرکی، اخلاق حمیدہ، غربا پروری، تواضع، حریفوں اور غنیموں کے ساتھ ہمدردی، استقلال، ثابت قدمی، خدا کی حمد وستائش کرنے والے کی صفت، مکاروں، زانیوں، قاتلوں، حریصوں اور افترا پردازی کے خلاف سختی شامل تھی، ہمت، استقلال، ترحم، شکر، والدین اور بزرگوں کی عزت کے بڑے داعی اور مبلغ تھے اور ہمہ وقت حمد باری تعالیٰ میں لگے ہوتے تھے'' جارج سیل نے خود حضورؐ کی توصیف ان الفاظ میں کی کہ ''آپ کی ہوش مندی، عاقلانہ اور کریمانہ برتاؤ اور رویہ جس کے تحت اپنے مشن میں مصروف رہے، اس جاہلانہ اعتراض کی تردید کرتے ہیں، کہ آپ ایک سخت خو مذہبی پیشوا تھے، سورفاتحہ کے متعلق وہ کہتے ہیں، کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ آپ کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کرتی ہے، تو وہ دیدہ ودانستہ جعل سازی نہیں کرتے تھے، آپ سورۂ فاتحہ نماز کی ہر رکعت میں بڑے خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے لیکن جارج سیل نے اس میں شک ظاہر کرنے سے گریز نہیں کیا، ریورنڈ Wherry نے سیل کے ترجمہ کو اپنی تفسیر کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کرایا اور خود دیباچہ میں یہ انکشاف کیا کہ نعوذ باللہ قرآن خود ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ جعل سازی کی پیداوار ہے اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ جھوٹا دعویٰ ہے کہ قرآن سابق کتب الٰہی کی تصدیق کرتا ہے، پادری صاحب نے اپنا مقصد ان الفاظ

میں واضح کیا کہ مسلمانوں میں اس کو واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اس کو تسلیم کریں، کہ حضرت عیسیٰؑ کی عظیم ہستی کے متعلق تمام انبیا نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ وہ خداوند قدوس کے فرزند اور گنہگاروں کے نجات دہندہ تھے۔

جناب اطہر حسین نے اپنی زبانی تقریر میں یہ فرمایا کہ انھوں نے اپنے مقالہ میں ان تمام تراشیدہ الزامات، اعتراضات، بہتان اور مفروضات کی تردید کی ہے اور آخر میں کہا کہ جارج سیل، دہری، رچرڈ بل، اربری، روڈ بل اور پکتھال نے قرآن کے ترجمے میں جو غلطیاں کی ہیں، ان کے چند نمونے میں نے اپنے انگریزی کتابچہ میں پیش کیے ہیں، اس وقت انہیں دہرانا ممکن نہیں، پکتھال نے جو غلطیاں کی ہیں وہ عبارت کی ہیں اور عربی زبان میں قرآن کے اسلوب اور عربی محاوروں سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کی ہیں، اربری کی غلطیاں ترجمہ میں اصل کی طرح موسیقیت اور نغمہ بھرنے کی کوشش کی وجہ سے ہوئیں اور کچھ عربی محاوروں سے ناواقفیت کی بنیاد پر بھی ہوئیں اوروں نے دیدہ ودانستہ اور بدنیتی سے فاش غلطیاں کیں۔

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری : پہلے ذکر آچکا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ظہران یونیورسٹی (سعودی عرب) کے نمائندہ کی حیثیت سے تشریف لائے تھے، اپنی متانت اور سنجیدگی کی وجہ سے شرکا کے جاذب توجہ بنے رہے، بولتے تو معلوم ہوتا کہ علم بول رہا ہے، ان کے مقالہ کا عنوان ''حدیث اور جوزف شاخت'' تھا، مائک پر آئے تو بولے کہ سب سے پہلے مجھے ایک معذرت کرنی ہے اور وہ یہ کہ میں نے یہ مقالہ انگریزی میں لکھا ہے اور انگریزی میں لکھنے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ اگر ہم اپنے مباحثہ سے مستشرقین کی اصلاح چاہتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ ہم اپنی آواز اسی زبان میں پہنچائیں، جو ان کے لیے قابل فہم ہو، اس مقالہ کے اصل مخاطب مسلمان نہیں ہیں، بلکہ اس کے مخاطب مستشرقین ہیں، یا وہ لوگ ہیں جو ان مستشرقین کے اٹھائے ہوئے سوالات سے دلچسپی لیتے ہیں، میں معذرت چاہتا ہوں کہ اس کا ترجمہ اردو میں نہیں کر سکا۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے مقالہ کا کچھ حصہ پڑھا، جو افسوس ہے کہ ٹیپ نہ ہو سکا، انشاء اللہ اس کا اردو ترجمہ معارف کی کسی آیندہ اشاعت میں شائع ہوگا۔

جناب اوصاف علی: جناب اوصاف علی ڈائرکٹر ہمدرد اسلامک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ بڑے جواں ہمت، لائق اور مجمع کو متاثر کرنے والے اہل قلم اور صاحب علم ہیں، دنیا کے ہر گوشہ کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک ہوتے رہتے ہیں، ان کا مقالہ بھی ٹیپ نہیں ہوسکا، ان سے مقالہ حاصل بھی نہیں کیا جاسکا ہے، انشاء اللہ یہ بھی معارف کی کسی آیندہ اشاعت میں شائع ہوگا۔

ڈاکٹر اکمل ایوبی: ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری صاحب کے مقالہ کے بعد جناب اکمل ایوبی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنا مقالہ ''مغربی مستشرقین کے چند بنیادی مقاصد ان کی ترکی تاریخ کی روشنی میں'' کے چند اقتباسات پڑھ کر سنائے، سب سے پہلے انھوں نے کہا کہ میں اوصاف صاحب سے یہ کہوں گا کہ مغربی مستشرقین زیادہ تر یہودی ہیں، جن کو اسلام سے گہری دل چسپی ضرور ہے، ان کے انہماک اور علمی تلاش داد کے لایق بھی ہے، وہ دیدہ ریزی اور دقت نظر کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں، ان کی کوششوں سے بہت سے علمی نوادرات بھی منظر عام پر آئے ہیں، وہ اخلاص وتصوف کے گہرے سمندر میں مشاق غوطہ خور کی طرح بار بار تیرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، انھوں نے ہمارے قدیم و نایاب علمی شہ پاروں کی تلاش و جستجو میں وقت بھی صرف کیا ہے، ان کے متون بھی شائع کیے ہیں، ان کا طرز بیان بھی شستہ اور شگفتہ ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغرب کے اہل قلم حضرات کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے متعلق شروع سے کلیسا کے علم برداروں سے تعصب و تنگ نظری کا جو ورثہ ملا تھا، اس سے وہ اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے، میں نے اپنے مقالہ میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان مستشرقین نے اپنی تحریروں میں کیا کیا مختلف طریقے استعمال کیے، انھوں نے اسلام اور اسلامی معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے کی خاطر سب سے پہلے ترکوں کو چنا اور ترکی کے قدیم تہذیب و تمدن کو اس طرح پیش کیا کہ بہت سے ترک ادیبوں نے اسلام سے اپنا رشتہ منقطع کرنے کی کوشش کی، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم کردار مصطفیٰ کمال اتاترک کا ہے، ان کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے صرف اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن سے ہی نہیں بلکہ اسلامی دنیا سے ہی رشتہ منقطع کرلیا، مغربی مستشرقین کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا، چنانچہ مغرب میں اتاترک کے کارناموں کا زور شور سے چرچا ہوا اور یہ ظاہر کیا گیا کہ ترکی میں ایسا انقلاب آ گیا ہے کہ ترکوں نے اسلام سے رشتہ بالکل منقطع کرلیا ہے، اسی اتاترک کو کسی نے سرفروش مجاہد، کسی

نے پر جوش فدائی، کسی نے قابل تقلید سیاست داں کسی نے قوم کا مصلح اعظم، کسی نے ملک وملت کا معمار، کسی نے عجوبۂ روزگار، کسی نے آزادی کا عاشق، کسی نے قوم کا مجاہدِ اعظم، کسی نے شمع آزادی کا پروانہ، کسی نے دل ودماغ اور روح سب کو آزاد کرنے والا انسان، کسی نے عظیم الشان جذبات کا نورانی پیکر کہا، ان ہی مستشرقین کی کتابیں ہم ہندوستانیوں کی معلومات کا ماخذ بنیں، اس لیے واقعات کی پوری نوعیت اور صحیح حقیقت پورے طور پر واضح نہیں ہوسکی اور نہ عام اور غیر سرکاری ترکوں کا نقطۂ نظر ہمارے سامنے آسکا، غالباً اسی وجہ سے ہندوستان میں مصطفیٰ کمال سے خوش عقیدگی پائی گئی اور دینی حلقوں میں بھی ان پر تنقید گوارا نہیں کی گئی، ان کے سیاسی وقومی خدمات کی وجہ سے ان کے لادینی اقدامات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے ہاں ایسا علمی وتحقیقی کام ہو جس سے مصطفیٰ کمال کی اصلاحات کے ساتھ مذہب سے ترکوں کی وفاداری کی تصویر بھی سامنے آجائے اور وہ فرق بھی ظاہر ہو جو حکومت کے مختصر اور محدود طبقہ میں اور مسلمان عوام ترک میں آج بھی موجود ہے، ابھی رسالہ ''اسلام اور عصر جدید'' کی جلد ۱۴، شمارہ بابت جنوری ۱۹۸۲ء میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے برنارڈ لوئس کے مقالہ ''اسلام'' کا ترجمہ شائع کیا ہے، یہ مقالہ کافی پہلے کا لکھا ہوا ہے لیکن یہ بہت کم لوگوں کی نظر سے گذرا ہوگا، اس میں برنارڈ لوئس نے خود اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں لکھی گئی اسلامی تہذیب وتمدن سے متعلق زیادہ تر کتابیں ایسے حضرات نے لکھی ہیں جو اصل ماخذ کی زبان سے ناواقف تھے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یوروپی تاریخ کی زیادہ تر کتابیں عثمانی حکومت اور اس کے اثرات کو مسخ کر کے پیش کرتی ہیں، یہ کتابیں خالصۃً مغربی شواہد پر مبنی ہیں، جو زیادہ تر ناقص، گھڑی اور غیر معتبر ہیں، ان میں ترکوں کے رول کی افسوس ناک حد تک گمراہ کن تعبیر ملتی ہے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے، کہ مسلمان اہل قلم، اپنی مذہبی، علمی، تہذیبی اور ادبی تاریخ خود مرتب کریں جو مستند معلومات پر مبنی ہو۔

اس کے بعد سید سلمان ندوی نے بزرگ عالم جناب قاضی زین العابدین کو مقالہ پیش کرنے کے لئے دعوت دی، قاضی صاحب کے مقالہ کا عنوان تھا ''ہمارے عصری، تعلیمی اداروں پر مستشرقین کے اثرات''

جناب قاضی زین العابدین صاحب : صدر محترم اور حاضرین کرام! بہت پابندیوں کے ساتھ مجھے یہاں بیٹھ کر آپ صاحبان سے خطاب کرنا ہے اور بغیر کسی تمہید کے میں یہ کہوں گا کہ مستشرقین کا تصور جو

ہمارے ذہن میں ہے، اس سے وہ تصور مختلف ہوسکتا ہے، جو ہمارے دوستوں کے ذہن میں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ استشراق کی تاریخ سولہویں صدی ہجری سے شروع نہیں ہوئی، بلکہ اسپین کے میدانوں میں مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد عیسائی پادریوں نے اسلام کا مقابلہ شتم رسول سے کیا، وہیں سے استشراق کی تاریخ شروع ہوجاتی ہے، تاریخ سے واقف لوگ جانتے ہیں، کس طرح اسپین کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف صف آرا کیا گیا، انھوں نے اس سلسلہ میں بڑی بڑی قربانیاں دیں، وہ آتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے، آپ کی شان میں گستاخیاں کرتے اور قتل ہوجانا گوارا کرلیتے، پھر شہدا کا نام پاتے، اسپین کے مسلمانوں کو ختم کرنے کے بعد پھر یورپ میں یہ مسئلہ سامنے آیا، کہ اسے کس طریقے سے مسلمانوں سے محفوظ رکھا جائے، اپنی ناقص رائے کے مطابق یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں آنجناب کا بت بنایا گیا اور بت بھی بہت شنیع قسم کا، کل یہ بحث چل رہی تھی کہ مسلمانوں کا محمڈن اور مسلمانوں کے کالجوں کا محمڈن کالج وغیرہ نام کا رواج کیسے چلا، وہ تو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کو بھی بگاڑنے کی فکر میں لگے رہے، جناب رسول اللہؐ کو محماد یا محمت کہا گیا اور آپ کا عجیب وغریب، شنیع اور نہایت ہی ناپاک قسم کا تصور ذہنوں کے اندر راسخ کیا گیا، اسی لیے انگریز ہندوستان میں آئے تو انھوں نے اسلام کو محمڈن ریلیجین قرار دیا اور بہت سے مسلمانوں نے اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس نام کو قبول کیا، اب گالی گلوج کا زمانہ نہیں رہا، زمانہ اس کا ہے کہ جوتیوں کو ریشم کے اندر لپیٹ کر پیش کیا جائے، عمدہ قسم کے شربت کے گلاس میں گندگی ڈالی جائے، مستشرقین نے یورپ میں ادارے قائم کر رکھے ہیں اور اسلامی اسٹڈیز کی تعلیم دیتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ انھوں نے تفسیر وحدیث اور سیرت وغیرہ کی نایاب کتابوں کے بھی ترجمے کیے، ان کو ایڈٹ کیا، ان کو طبع کرایا، اس سلسلہ میں مسند احمد بن حنبل کی طباعت پر واقعی سارا عالم اسلام ان کا شکر گزار ہے، یہ واقعی بڑی خدمت ہے، ہمارے مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے تو بہت ہی مبالغہ آمیز طریقہ پر اس کی تعریف کی ہے، اس بے چارے کو مسند احمد بن حنبل کا ایک ایک لفظ اس لیے دیکھنا پڑا کہ اس کو کتاب چھپوانے میں پروف ریڈنگ خود ہی کرتا تھا اور علمائے اسلام اس لیے مطالعہ نہ کرسکے کہ اس وقت تک یہ چھپی نہ تھی، اس کتاب کی طباعت واشاعت سے اس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کی تعلیمات سے واقف ہونا نہیں تھا، میں

ان لوگوں کو بُرا نہیں سمجھتا ہوں، ذاتی طور پر یہ لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں، مجھے کینٹول اسمتھ صاحب سے ملاقات کرنے کا موقع ملا اور میری ان سے جو گفتگو ہوئی، اس کی ترجمانی پروفیسر محمد مجیب نے کی، بہت اچھے آدمی ہیں، انھوں نے مجھ کو بتایا کہ عراق، شام اور دوسرے اسلامی ملکوں میں لاالــہ الااللــہ کے ورد کے طریقے کیسے کیسے مختلف انداز کے دیکھے، میں نے اس وقت بھی اور بعد میں اپنے دوستوں سے کہا کہ کاش یہ ضربیں پروفیسر اسمتھ کے کان سے گذر کر دل تک بھی پہونچتیں، ویسے وہ بہت نیک آدمی ہیں، میں اپنا مقالہ شروع کرنے والا تھا کہ اس سے پہلے ہی ختم کرنے کا تقاضا کیا گیا، اس لیے میں مقالہ تو چھوڑے دیتا ہوں لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ مسند احمد بن حنبل کو ایک مستشرق نے ایڈٹ کیا ہے، مستشرقین کی نئی نئی کتابیں آرہی ہیں اور بہت خوبصورت آرہی ہیں، اندر کیا ہوتا ہے وہ دیدہ ور ہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، ہمارے جدید تعلیم یافتہ مسلمان ان کی طرف لپکتے ہیں اور ان کی صورت شکل دیکھ کر طبیعت یہ چاہتی ہے کہ ہم بھی ان کا مطالعہ کریں لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اس شربت روح افزا کے اندر زہر کے قطرے ملے ہوئے ہیں، اسلامک اسٹڈیز کی طرح جدید اسلامی فکر کے جو ادارے جگہ جگہ قائم ہورہے ہیں، افسوس ہے اس میں وہی کتابیں پڑھائی جارہی ہیں، جو مستشرقین یورپ کی لکھی ہوئی ہیں، ہمارے دوست جو پروفیسر اسمتھ کے شاگرد ہیں وہ ان کا یقیناً احترام کریں گے اور ان کو کرنا چاہیے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہماری مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اور جامعہ عثمانیہ وغیرہ کے مخلص بانیوں نے تعلیم دینیات کے لیے اسلامی اور دینی ادارے قائم کیے، ان میں سے بعض یونیورسٹیوں میں دینیات کے شعبے ختم کیے جاچکے ہیں، اور اسلامک اسٹڈیز کے ادارے بھی قائم ہوئے ہیں، میں جب جامعہ ملیہ میں تھا تو میں نے بخاری پڑھائی، میں نے وہاں تفسیر بھی پڑھائی، فقہ کے ساتھ ساتھ حماسہ پڑھائی اور متنبی اور سبعہ معلقہ بھی پڑھایا لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہاں یہ ڈپارٹمنٹ ہی ختم کردیا گیا ہے اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ قائم ہے، میں نے ابھی حال ہی میں ایک لکچرر صاحب جناب ماجد علی خاں صاحب کا ایک مضمون پڑھا تو مجھے بہت افسوس ہوا، مستشرقین نے علوم اسلامیہ کی جو تاریخ دی ہے، یا جو انھوں نے تنقید کی ہے ان کو ضرور پڑھیے، مطالعہ کیجیے اور جواب دیجیے، لیکن طلبہ کے ذہن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرچشمہ سے سیراب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن، حدیث، علم

کلام اور فقہ کی اصل کتابیں نصاب میں داخل رہیں جیسا کہ علی گڑھ میں ہے کہ شعبۂ دینیات بھی ہے، اسلامک اسٹڈیز بھی ہے، اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ آپ قائم کرسکتے ہیں، تاریخ، فقہ، تاریخ حدیث اور تاریخ قرآن کے پڑھانے سے ہم آپ کو منع نہیں کرتے لیکن ایسی تاریخیں جو فقہاء صوفیاء اور محدثین کے کیرکٹر کو مجروح کردیں اور ان بنیادوں کو ہی گرادیں جن پر اسلام اور محدثین اسلام کی عمارت کھڑی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ہی غلط ہوگا، میں بلڈ پریشر کا بھی مریض ہوں اور ادھر اوپر سے بھی دباؤ پڑ رہا ہے، میں اپنے ان دوستوں سے جو اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں میں پڑھا رہے ہیں، اور ناواقفیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، معذرت کرتا ہوں، وہ لوگ اخلاقی اعتبار سے بہت اچھے ہیں، مگر ظاہری اخلاق کے اعتبار سے وہ اپنے اساتذہ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

قاضی صاحب کی اس تقریر کے بعد جامعہ ملیہ کے پروفیسر مشیر الحق صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے، ڈاکٹر سید سلیمان ندوی نے ان سے کہا کہ وہ مختصر طریقہ پر اپنا جواب دیں۔

پروفیسر مشیر الحق صاحب : پروفیسر مشیر الحق صاحب نے کہا کہ شاگردان مستشرقین پر تین دنوں سے جو کچھ کہا جارہا ہے، اس پر تو میں کچھ بھی نہیں کہوں گا، اس لیے کہ شاید اسی طرح ان کے ناکردہ گناہوں کی کچھ نہ کچھ تلافی ہوتی جارہی ہے لیکن چوں کہ مولانا نے ایک متعین ادارہ کا نام لے کر وہاں کے بارہ میں جو معلومات مہیا کی ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ مولانا کو ان کے بارہ میں پوری طرح صحیح اطلاع نہیں ہے، جامعہ ملیہ میں کبھی بھی دینیات کے نام سے کوئی شعبہ قائم نہیں تھا، جس کو ختم کردینے کا کوئی سوال پیدا ہو، مولانا حماسہ و متنبّی اور اسی قسم کی جو کتابیں پڑھاتے رہے ہیں، تو وہ چیزیں آج بھی باقی ہیں، فرق اتنا ہوگیا ہے کہ یہ شعبۂ عربی کی چیزیں ہیں، شعبۂ عربی میں پڑھائی جارہی ہیں، اسلامک اسٹڈیز یا شعبۂ دینیات کے نام سے پہلے جامعہ ملیہ میں کوئی شعبہ نہیں تھا، بلکہ ایک سسٹم تھا جس میں یہ مضامین پڑھائے جاتے تھے، ۵۲ء سے میں جامعہ سے منسلک ہوں، میں نے وہیں تعلیم حاصل کی، اس وقت بھی وہاں کوئی ایسا ڈیپارٹمنٹ نہیں تھا، ممکن ہے جس وقت مولانا محمد علی جوہر نے جامعہ ملیہ قائم کی اس وقت کوئی ایسا شعبہ رہا ہو، جو لوگ ہندوستان میں رہتے ہیں، ان کو یہ بات سوچنی چاہیے کہ عربی ودینی مدارس میں جس طرح سے تعلیم ہوتی ہے اور جس پس منظر سے طالب علم آتے ہیں، اس میں اور

یونیورسٹیوں میں جو طالب علم آتے ہیں، ان میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔

پروفیسر مشیر الحق صاحب کی اس وضاحت کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے شبلی کالج کے ایک نوعمر طالب علم مرزا اسمر بیگ کو اسٹیج پر بلایا، اس کمسن طالب علم کی حوصلہ افزائی کے لیے بولنے کا موقع دیا گیا، اس کمسن بچے نے انگریزی میں بہت صاف اور متین لہجہ میں مستشرقین پر ایک تقریر کی، اس کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے صدر نشین جناب ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق کو صدارتی کلمات کہنے کی زحمت دی۔

ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق: ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دارالمصنفین کے کارکنان کا شکریہ ادا کیا، سمینار کی کامیابی پر مبارک باد دی، انھوں نے کہا اکثر مقالات سے یہ ظاہر ہوا کہ مستشرقین نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں سے اکثر کی تحریروں میں تعصب اور ان کے جہل اور ناواقفیت کا اظہار ہوتا ہے، مجموعی طور پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مستشرقین سے کوئی بہتر توقع نہیں کی جاسکتی، اس لیے ان سے خوش گمانی کے کوئی معنی نہیں، قرآن پاک بھی ایسی ہی تعلیم دیتا ہے، خدا تعالیٰ کا قول ہے، وَلَاتُـوْمِنُوْا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ لہٰذا ہمارے دین کے علاوہ جو دوسرے ادیان کے پابند ہیں، ان کی بات کو کس طرح ہم قابل اعتماد اور قابل وثوق سمجھ سکتے ہیں، قرآن پاک اور تعلیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو یہ بھی سکھاتی ہے کہ لَايَـلْـدَغُ الْـمُـوْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَّرَّتَيْنِ جب ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ رسول اللہؐ کے زمانہ سے لے کر آج تک یہ مستشرقین ڈنک مارتے اور ہم کو نقصان پہنچاتے رہے، تو پھر ان کے حسن نیت پر یقین کر لینا اور ان کی طرف سے صفائی پیش کرنا کچھ معنی نہیں رکھتا، دوسری بات یہ ہے کہ مستشرقین میں سے وہ مستشرقین جنھوں نے واقعی صاف دل اور حسن نیت سے اسلام کا مطالعہ کیا ہے، تو پھر ان کا دل اسلام کی حقانیت سے معمور ہوا اور وہ اسلام میں داخل ہو گئے، مستشرقین جب تمہید کے طور پر اسلام کی یا رسول اسلام کی تعریف کرتے ہیں تو درحقیقت وہ ان کی ایک علمی اور ماہرانہ چال ہوتی ہے، جس کے بعد وہ اپنا اصل مقصد بیان کر کے اپنی منزل مقصود تک پہنچنا چاہتے ہیں، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مفصل پروگرام وضع کر کے ضروری تجویزیں پیش کی جائیں، ایک تجویز یہ ہو کہ ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے جو مستشرقین کی غلطیوں کی نشاندہی کرے اور ان کو مرتب کر کے یکجا کرے، تاکہ ان پر غور کیا جاسکے، ایک اور تجویز جو قابل غور ہے وہ یہ کہ

اسلامی یونیورسٹیاں اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبے اس بات کا اہتمام کریں کہ ان کے طالب علم مستشرقین کے مراجع پر اعتماد نہ کریں، بلکہ خود مسلمانوں کی کتابوں کو اعتماد کا مقام دیں اور محض ضمنی طور پر مستشرقین کی کتابوں کو استفادہ کے لیے رکھیں، اس کی بھی ضرورت ہے کہ یونیورسٹیوں کے طلبہ کو یورپ میں ایسی جگہوں پر نہ بھیجا جائے، جہاں وہ مستشرقین سے استفادہ پر مجبور ہوں، ایک اہم مسئلہ مستشرقین کے تلامذہ کا ہے، یعنی وہ افراد اور نوجوان جو مستشرقین کے افکار سے زیادہ متاثر ہیں، ان لوگوں کے بارے میں عام طور سے بدگمانی مناسب نہیں ہے، کیوں کہ ان میں بہت سے ایسے اسکالر ہیں جنھوں نے سفارت کا صحیح حق ادا کیا ہے، اچھی ترجمانی کی ہے، صحیح تعارف کرایا ہے، اپنے مستشرقین اساتذہ کے تعارف میں ادب کا لحاظ کرتے ہوئے ان پر تنقید بھی کی ہے، ان حضرات میں ڈاکٹر عبدالکریم، ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی، ڈاکٹر محمد امین مصری اور ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی جیسے محققین اور دانش ور ہیں، آخری بات یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں جو تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی اس میں ایک تجویز پاس ہوئی تھی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مروج موجودہ نصاب تعلیم کو کھنگالا جائے اور ان سے وہ تمام اجزاء نکالے جائیں جو اسلامی علوم وفنون کے لیے زہر کا درجہ رکھتے ہیں، اور نیا نصاب مدون کیا جائے، جو ان تمام خدشات سے پاک ہو۔

ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق کی اہم تقریر کے بعد جلسہ کے ناظم جناب ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے ان مقالہ نگاروں کے نام کا اعلان کیا جن کے مقالے وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھے نہ جا سکے، ان سے معذرت کی گئی اور یقین دلایا گیا کہ یہ مقالے آئندہ شائع ہوں گے ان مقالہ نگاروں کے نام اور ان کے مقالات کے عنوانات یہ تھے:

(۱) المستشرقون والسيرة النبوية از الدكتور عمادالدين خليل (عراق) (۲) المستشرقون والاسلام از الاستاذ انور الجندی (مصر) (۳) المستشرقون والقرآن ازایضًا (۴) المستشرقون والسنة ازایضًا (۵) المستشرقون والسيرة النبوية ازایضًا (۶) المستشرقون والتاريخ ازایضًا (۷) هذا هو الاستشراق فما هي عدتنا نحوه از مولانا سعيد الرحمن الاعظمی استاذ ندوة العلما لکھنؤ (۸) اسلام اینڈ دی

اور پٹلست، از جناب محی الدین صاحب (لکھنؤ) (۹) مغرب کا تصور اسلام اور اس کا سیاسی پہلو، از ڈاکٹر عماد الحسن آزاد فاروقی (جامعہ ملیہ نئی دہلی) (۱۰) کیا حضرت ابراہیم کی شخصیت مدنی سورتوں میں مکی سورتوں سے مختلف ہے؟ اسپرنگر اور وینسک کے اعتراضات، از مولانا ضیاء الدین اصلاحی (دارالمصنفین اعظم گڑھ) (۱۱) اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ، از قاضی عبدالحمید (اندور) (۱۲) اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ، از عبداللہ سرفراز الٰہ آباد (۱۳) استشراق اور اسلام، کل اور آج، از ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری (پٹنہ) (۱۴) مستشرقین اور علامہ محمد اقبال، از پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں یونیورسٹی)

ڈاکٹر عبدالکریم ساتو: اس آخری نشست کے وقفہ کے بعد جو کارروائی شروع ہوئی تو اس کی صدارت قطر کے علامہ یوسف القرضاوی نے کی، نظامت کے فرائض جناب مولانا محمد رابع ندوی صاحب نے انجام دیے، سب سے پہلے جاپان کے ممتاز فاضل اور عالمی مساجد کونسل کے ممبر جناب ڈاکٹر عبدالکریم ساتو کو مجمع کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی، انھوں نے انگریزی میں اپنی مختصر تقریر میں اس سمینار کے انعقاد اور اس کے بہ حسن وخوبی خاتمہ پر اپنی خوشی کا اظہار کیا، پھر انھوں نے بتایا کہ وہ پشاور اور لاہور سے افغانی مہاجرین کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس سمینار میں شرکت کے لیے آئے ہیں، وہ زیادہ تر افغانی مہاجرین کی مالی اور مادی امداد کرنے کی طرف توجہ دلاتے رہے، پھر بتایا کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت کی عمر زیادہ نہیں لیکن بحمداللہ وہاں مسلمان تیزی سے بڑھ رہے ہیں، وہاں ان کی مسجدیں اور انجمنیں ہیں، وہ سوم کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں، اور عالم اسلام کے بھائیوں سے تعاون کے خواست گار ہیں۔

علامہ یوسف القرضاوی: ڈاکٹر عبدالکریم ساتو کے بعد علامہ یوسف القرضاوی نے عربی میں ایک جامع اور پراثر تقریر موقع کی مناسبت سے کی، جس کا خلاصہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو یہ مبارک موقع عطا فرمایا، آج ہم ایک پلیٹ فارم پر اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ اسلام کی خدمت علمی انداز سے کرسکیں اور یہ خدمت اسلام اور دور حاضر کی زبانوں میں ہو، اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہاں اس لیے بھی جمع کیا ہے کہ ہم اس کے اور اس کے دین کی نصرت وکامرانی کے لیے میدان عمل میں اتریں، دعا ہے کہ اس کی مدد ہمارے شامل حال ہو، ہم خوش

قسمتی سے ایک نئی صدی یعنی پندرہویں صدی ہجری میں داخل ہو رہے ہیں، جب کہ ہم کو اپنا جائزہ لینا چاہیے اور اپنا احتساب کر کے ہم سلب سے ایجاب، قول سے عمل اور انتشار سے اتحاد کی طرف گامزن ہوں، عیسائی مبلغوں، اسلام دشمن طاقتوں اور مستشرقین نے ماضی میں اپنے مادی اور فکری حملوں سے مسلمانوں کو دفاعی محاذ پر لا کھڑا کیا ہے اور اس حالت دفاع میں ہم سوائے معذرت کرنے کے زیادہ کچھ نہ کر سکے، معذرت کا رویہ اور کمزوری کا احساس اور اظہار اب ختم ہونا چاہیے، مغرب کی سیاسی اور فکری بالا دستی نے آخر انسانیت کو کیا دیا؟ ان لوگوں نے چاند پر کمندیں ڈالیں، وہاں سے مٹی اور پتھر لائے لیکن اس ارضی سیارہ میں رہ کر اپنے نفس پر تو کوئی کمند نہ ڈال سکے اور نہ رنج وغم سے دامن چھڑا سکے، نہ خوف ودہشت سے آزاد ہو سکے اور نہ اس روحانی سعادت کی جھلک پا سکے، جس کا امتیاز سرمایۂ سکون وطمانیت ہے، یہ چیز ان کے ہاتھ کیسے آسکتی تھی، یہ تو ایمان حقیقی کے ادراک سے ملتی ہے، کیا یہ مارکسیت کے دست مادیت سے مل سکتی ہے، یا وجودیت اس کو وجود میں لا سکتی ہے؟ یا مسخ شدہ مسیحیت اس کو باز یافت کر سکتی ہے؟ نہیں، یہ نسخۂ کیمیا صرف اسلام کی حیات بخش تعلیمات میں موجود تھا، عقل ودل، دنیا وآخرت، مادہ وروح، حق وفرض، فرد کی مصلحت اور معاشرہ کی ضرورت کی بیک وقت جامعیت کا نمونہ کہیں اور بھی ہے؟ صرف اسلام کے پیغام میں یہ قوت اور اثر ہے کہ وہ انسان کو براہ راست مخاطب اور متاثر کر سکتا ہے، یہ انسان خواہ مشرق کا ہو یا مغرب کا خلوت میں ہو یا جلوت میں، خاندان میں ہو یا معاشرہ میں، اسلام ہر حال میں اس سے مخاطب ہے لیکن اسلام کی اس قوت اور تاثیر کے باوجود ہم خود کمزور بنتے گئے، اس کے تاریخی اور سیاسی اسباب جو بھی رہے ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کے زیب وزینت اور چمک دمک اور اس کی ترقی وبالا دستی سے ہماری پلکیں جھپکتی رہیں، اس تہذیب کے علم برداروں کے سیاسی، فوجی اور سائنسی غلبہ سے ہم مرعوب بھی رہے لیکن یہ ایک وقتی بات تھی، ہم کو اس سے چھٹکارا پانا تھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم بڑی حد تک مغرب کی طلسم کاریوں سے نکل آئے ہیں، اب ہمارا رویہ معذرت خواہانہ نہ ہونا چاہیے، مستشرقین نے ہمارے مذہب کے بارہ میں بے شمار غلط فہمیاں پھیلائیں، اپنی علمی اور تحقیقی فریب کاریوں سے ہماری نسلوں کو متاثر کرنے میں کامیاب بھی ہوئے لیکن یہ دور گذر چکا، جس طرح ہر فریب، ہر سازش اور ہر جھوٹ کا ایک وقت ہوتا

ہے، اسی طرح ان مستشرقین کا بھی ایک وقت تھا، جواب ختم ہو چکا ہے، ان کا اصلی چہرہ سامنے آگیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ طاقت ور نہیں تھے، بلکہ ہم کمزور تھے، خرگوش اور لومڑی کے اس قصے کی طرح کہ جب ایک لومڑی نے خرگوش کو دبوچا تو وہ چیخا، اس کی چیخ سن کر لومڑی کو اپنی طاقت کا احساس ہوا، اس وقت خرگوش نے کہا، میں اس لیے نہیں چیخا کہ تمہاری گرفت سخت تھی، میں صرف اپنی کمزوری کو سوچ کر چیخا، تم طاقت ور نہیں ہو، ہاں میں کمزور ہوں، تو واقعہ یہی ہے کہ ہم مسلمان کمزور ہو گئے، ورنہ مستشرقین کے یہاں کوئی ایسا علمی انکشاف نہیں، جو نیا اور اچھوتا ہو اور اس کا جواب نہ ہو سکتا ہو، ان کے بعض اعتراضات اور شبہات تو ظاہر کیے ہیں کہ علمی دیانت اور متانت کو ہنسی آجاتی ہے، اب ہم کمزور نہیں رہے، بلکہ اب ہم اس دور میں ہیں جب حسن قبول ہمارے لئے چشم براہ ہے، یہ عمل کا دور ہے، گزشتہ صدیاں سرمایہ داری اور اشتراکیت کی تھیں، موجودہ صدی اسلام کی فتح مندی اور کامرانی کی ہے، ہم عہد ساز بن سکتے ہیں، جس کے بعد ہماری آیندہ نسلیں ہمارا محاسبہ کریں گی، تو شاید وہ یہ اعتراف کریں کہ ہم نے اپنے دور میں دین کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ہم سے کوتاہی کیوں ہو، ہمارے پاس وسائل ہیں، قوت ہے، ایک یہ بھی ہے وَاذْكُرُوْا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ (اعراف) یعنی یاد کرو جب تم تھوڑے سے تھے تو اللہ نے تم کو زیادہ کیا، ہمارے پاس معدنی دولت ہے، زمین کے سرسبز اور شاداب علاقے بھی ہماری ملکیت میں ہیں اور سب سے بڑھ کر ہمارے پاس روحانی دولت کا خزانہ ہے، ہم عظیم ترین پیغام اور طاقت ور ترین عقیدے کے حامل ہیں، ہمارے پاس قابل فخر تہذیبی وتمدنی ورثہ بھی ہے، پھر ہم کیوں کمزور بنیں، ہم اللہ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے، یہ سمینار اپنے فرائض کی ادائیگی کے لے ایک بہترین یاددہانی ہے، خواب غفلت سے بیدار ہونے کا ایک ذریعہ ہے، اس میں ایسے علما وفضلا موجود ہیں جو اس فرض کو بحسن وخوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اللہ تعالےٰ ان سے یہ کام لے سکتا ہے اور کیا عجب ہے کہ یہ سمینار اسلام کے غلبۂ نو، اس کے علم کی سربلندی اور دنیا میں حکومت اسلامیہ کے قیام کے لیے ایک نقطۂ آغاز ثابت ہو، میں دارالمصنفین، اس کے کارکنوں اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کا شکر گذار ہوں اور ان سب حضرات کا بھی شکر ادا کرتا ہوں، جنہوں نے اس سمینار کے انعقاد، نگرانی، بحث ومباحثہ، مقالہ خوانی اور مقالوں کے عربی اردو

ترجمے کرنے میں حصہ لیا، اللہ تعالے سے دعا ہے کہ وہ ہماری غلطیوں سے درگذر فرمائے اور ہم کو حق پر ثبات کی توفیق بخشے اور ہمیں اپنی مدد کا مستحق بنائے، وآخر دعونا ان الحمدلله رب العٰلمین،

زیادہ تر مجمع اس عربی تقریر کو سمجھ نہیں رہا تھا لیکن فاضل خطیب کی شان خطابت سے متاثر تھا اور جب اس کا خلاصہ اردو میں سنایا گیا تو سامعین کے چہروں سے اس تقریر کی بشارت سے بشاشت کے غیر معمولی آثار نمایاں تھے، سمینار میں اس کا اہتمام تھا کہ اردو کے مقالات اور تقریروں کا خلاصہ عربی میں کیا جاتا، اسی طرح عربی میں تقریروں اور مقالوں کا ترجمہ اردو میں کردیا جاتا، یہ فرائض مولانا محمد رابع ندوی، مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی اور بائیس تیئیس سالہ نوجوان مولوی سلمان ندوی انجام دیتے رہے، مولانا رابع ندوی اور مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی جب عربی سے اردو یا اردو سے عربی میں خلاصہ پیش کرتے تو اس کو سن سن کران کی مسلمہ قابلیت اور فضیلت کی وجہ سے کوئی تعجب نہ ہوتا، وہ توقع کے مطابق یہ فرض انجام دیتے رہے لیکن جب کمسن مولوی سلمان ندوی اپنی فرشتہ صورت، نئی نئی خوبصورت ڈاڑھی، قدرعنا اور جامہ زیبی کے ساتھ مائک پر آتے اور عربی یا اردو میں خلاصہ پیش کرتے وقت اپنی خطیبانہ آواز کی دلکشی سے حاضرین کی سامعہ نوازی کرتے تو وہ زبان حال سے کہتے نظر آتے کہ یہ لڑکا سمینار کی جان اور شان بنا ہوا ہے، اور سب کے دل سے دعائیں نکلتیں کہ اللہ تبارک وتعالے اس نوجوان کی عمر دراز کر کے اس کو ملک وملت کا مایۂ ناز فرزند اور خدمت گذار بنادے آمین،

علامہ یوسف القرضاوی کی صدارتی تقریر کے بعد مولانا محمد رابع ندوی نے ایک کمیٹی کی تیار کی ہوئی تجویزیں پیش کیں، جن کو متفقہ طور سے منظور کیا، یہ حسب ذیل ہیں:

اس مجلس مذاکرہ کے مضامین، نیز تجاویز کے مطالعہ سے آئندہ کے لائحۂ عمل کے لے چھ نکات سامنے آئے، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جو لٹریچر موجود ہے اور آئندہ بھی جو لٹریچر سامنے آئے، اس کا علمی مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے اور علمی اور معیاری بنیاد پر مستشرقین کی غلطیوں کو واشگاف کرنے اور ان غلطیوں کی تصحیح کے لیے ایک واضح تصنیفی وتالیفی پروگرام مرتب کیا جائے۔

(۲) اسلام، تاریخ اسلام، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کی اہم شخصیتوں اور ان

کے فکری، علمی اور ادبی کارناموں سے متعلق اسکول سے لے کر یونیورسٹیوں کی سطح تک کے طلبہ کے لیے جدید مذاق کے مطابق ایسی کتابیں تیار کرائی جائیں جو ان کے تعلیمی نصاب کا حصہ بن سکیں اور جن سے تعلیم و تدریس کی سطح پر بچوں اور نوجوانوں کے ذہن کی تربیت کا کام لیا جاسکے۔

(۳) اسلامی موضوعات پر حوالہ جات کی معیاری کتابیں تیار کی جائیں۔

(۴) اسلام سے متعلق علم و تحقیق کے جو ادارے پہلے سے موجود ہیں ان کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کی جائے اور ان کے یہاں جو کام ہو رہا ہے اسے موجودہ علمی و تحقیقی معیار کے مطابق اور بہتر اور مفید تر بنانے کی کوشش کی جائے۔

(۵) تصنیف و تالیف کے اس تمام کام کا علمی معیار اور تعلیمی مرتبہ دنیا کے موجودہ معیار تحقیق اور جدید اصول تعلیم کے مطابق ہو، تاکہ ان کتابوں کا مطالعہ مسلم اور غیر مسلم سب ہی لوگ دلچسپی سے کریں اور اسلام اور اسلام سے متعلق دیگر موضوعات پر صحیح معلومات حاصل کرسکیں اور مستشرقین کی کتابوں سے مستغنی ہوسکیں۔

(۶) دارالمصنفین نے اسلامی موضوعات پر جو گراں قدر مطبوعات پیش کی ہیں، ان کو عربی زبان اور آج کی زندہ یورپین زبانوں خصوصاً انگریزی میں منتقل کیا جائے، تاکہ ان سے بڑے پیمانہ پر استفادہ کیا جاسکے اور اس طرح ہم اس مذاکرۂ علمی کے مقاصد کو علمی جامہ پہنا سکیں،

اس مذاکرۂ علمی کے شرکا مستشرقین کی ان علمی کاوشوں کو قابل قدر سمجھتے ہیں، جو انھوں نے اسلامی سرمایہ کی حفاظت اور بعض لغات اور مفید کتابوں کی نشر و اشاعت میں خالص علمی انداز سے کی ہیں، جن سے ان سے استفادہ آسان ہوگیا، اس سلسلہ میں ہم "المعجم المفهرس لالفاظ الحديث" "مفتاح كنوز السنة" اور تاریخ ادب کی بعض کتابوں کا نام خصوصیت سے لے سکتے ہیں، اسی طرح ہم بعض انصاف پسند اور غیر متعصب مستشرقین کے مطالعہ اسلام اور تہذیب اسلام کو قابل قدر سمجھتے ہیں، مگر اسلامی علوم و فنون سے متعلق اکثر مستشرقین کی غلط فہمی اور مذہبی اور سیاسی عصبیت پر رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہیں، انھوں نے اسلامی عقیدہ و شریعت، قرآن و سنت، سیرت و تاریخ اور تہذیب و تمدن کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے، جس کے بہت سے عوامل ہیں، نفسیاتی بھی، تاریخی بھی اور سیاسی بھی۔

اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر مجلس مذاکرہ کا یہ جلسہ طے کرتا ہے کہ اس موضوع پر (دوسال کے وقفہ سے یہ مجلس مذاکرہ منعقد کی جاتی رہے) اس سلسلہ میں یہ جلسہ دکتور شیخ یوسف القرضاوی کی اس پیش کش کو کہ دوسال کے بعد مجلس مذاکرہ قطر میں منعقد کی جائے، شکریہ اور تحسین کے جذبہ کے ساتھ قبول کرتا ہے یہ جلسہ جناب حکیم محمد سعید صاحب کا بھی شکر گذار ہے کہ وہ یہ مجلس مذاکرہ قطر کے بعد پاکستان میں منعقد کرائیں گے۔

یہ جلسہ یہ بھی طے کرتا ہے کہ اس سلسلہ میں مزید پیش رفت کے لیے دارالمصنفین میں ایک دفتر رابطہ قائم کیا جائے، جو سمینار کے فیصلوں کے مطابق عمل درآمد کریا اور اہم امور میں حسب ذیل فضلاء سے رابطہ قائم کرے:

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ہندوستان) (۲) سید صباح الدین عبدالرحمٰن (ہندوستان) (۳) مولانا سعید احمد اکبرآبادی (ہندوستان) (۴) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (ہندوستان) (۵) دکتور شیخ یوسف القرضاوی (قطر) (۶) دکتور عبدالصبور مرزوق (رابطہ عالم اسلامی مکہ) (۷) دکتور محمد فتحی عثمان (لندن) (۸) دکتور عبدالسلام الہراس (مراکش) (۹) دکتور عبداللہ نصیف (جدہ) (۱۰) دکتور عبداللہ عبدالمحسن الترکی (ریاض) (۱۱) دکتور عبدالوہاب ابوسلیمان (مکہ مکرمہ) (۱۲) دکتور عبداللہ بن عبداللہ زاید (مدینہ منورہ) (۱۳) دکتور ظفر اسحاق الانصاری ظہران (سعودی عرب) (۱۴) پروفیسر سید حسین نصر (ایران) (۱۵) ڈاکٹر سید سلمان ندوی (جنوبی افریقہ) (۱۶) ڈاکٹر محمد کمال حسن (ملیشیا) (۱۷) جناب حکیم محمد سعید صاحب (پاکستان) (۱۸) پروفیسر خورشید احمد (پاکستان) (۱۹) ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (پاکستان)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن اس کمیٹی کے سکریٹری ہوں گے، انھیں یہ اختیار ہوگا کہ وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مشورہ سے دفتر رابطہ کی ضروریات کے لیے مناسب اسٹاف مقرر کریں۔

خاک سار کی الوداعی تقریر: ان تجویزوں کے منظور ہونے کے بعد خاک سار نے اس سمینار کی کامیابی پر اپنے امتنان وتشکر کے جذبات کا اظہار کیا، جن کی شدت کی وجہ سے الفاظ خیالات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، دل تھا کہ امنڈ رہا تھا، آنکھیں اشکبار تھیں، ان ہی کیفیات کے ساتھ عرض کیا:

صدر محترم! میں اپنی اشکبار آنکھوں اور جذبات کے تلاطم کے ساتھ آپ کا، اپنے معزز اور باوقار مہمانوں اور ان ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جنھوں نے اس سمینار کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، کاش میری آنکھوں میں خوشی کے اتنے آنسو ہوتے کہ ان آنسوؤں کا ایک ایک ساغر اور ایک ایک پیانہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرتا، پھر بھی میرے امتنان اور تشکر کا اظہار پورے طور پر نہ ہوتا، حضرات! آج سے کئی سال پہلے یہ خیال ہوا کہ اسلام اور اور ینٹلسٹ، کے عنوان سے ایک سمینار منعقد کیا جائے دارالمصنفین کی گذشتہ اڑتالیس سالہ زندگی میں انگریز مصنفوں کی کتابیں اور تحریریں پڑھ کر ان کی زہر چکانیوں سے بڑی تکلیف محسوس کرتا رہا، کہ وہ اپنی معروضیت یعنی آبجکٹویٹی کے پردے میں ہمارے مذہب، ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کو طرح طرح سے نقصان پہونچا رہے ہیں، خیال آیا کہ اس کے سد باب کے لیے بہت ہی شرح وبسط کے ساتھ ایک مجلس مذاکرہ منعقد کرائی جائے، مگر اس کو عمل میں لانے کے لیے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ دارالمصنفین کے کنج عافیت بلکہ ویرانے میں کوئی شاندار اجتماع نہ ہو سکے گا، کیونکہ ہم اپنے مہمانوں کو ان کے معیار کے مطابق راحت اور سہولت نہ پہونچا سکیں گے، ہمارے دارالمصنفین کے مایۂ ناز اسلاف کا مسلک یہ رہا ہے کہ Farom the Madding Crowd of Cities-Under the Grderwood treeS- یعنی شہر کے جنون خیز ہنگاموں سے دور سبزہ زار درختوں کے سایہ کے نیچے بیٹھ کر صرف اپنے علمی کاموں میں مشغول رہیں، ہم کو فخر ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے بوریے پر بیٹھ کر اور دنیا کی تمام آسائشوں اور نعمتوں سے منھ موڑ کر علوم وفنون کی خدمت کی، ہم نے اس مذاکرہ کے موقع پر اپنے مہمانوں کو کسی تفریح گاہ میں لے جا کر ضیافت تو نہیں کی لیکن ہمارے بزرگ علوم وفنون کے گل وصنوبر کا گلشن دارالمصنفین میں بہائے ہیں وہاں آکر ہمارے مہمانوں کو اگر تھوڑی بہت ذہنی تفریح ہوگئی ہوگی، تو یہی ہماری محنت کا بڑا صلہ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بزرگوں کی روحیں بھی اس اجتماع میں ضرور آئی ہوں گی، اجازت دیجیے تو ان بزرگوں کے اس گلشن میں آنے والے مہمانوں کی خدمت میں ان کی طرف سے یہ عرض کروں۔

نسیم نو بہاری کی طرح آئے ہو گلشن میں ☆ تماشائے گل وسرو وصنوبر دیکھتے جاؤ

حضرات! آپ نے اس سمینار میں جو کچھ دیکھا اس میں میری ہمت اور محنت کے بہ جائے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی حوصلہ افزائی زیادہ کارفرما رہی، وہ یہ کہہ کر برابر ہمت بڑھاتے رہے کہ کام شروع ہو جائے، پھر ساری چیزیں خود بخود انجام پا جائیں گی، وہ مجھ سے اتنے اونچے ہیں، کہ ان کی اونچائی تک میری نگاہ کسی طرح نہیں پہونچ سکتی لیکن جب وہ استاذی المحترم حضرت مولانا سلیمان ندوی کی شاگردی کے رشتہ سے مجھ کو اپنا بڑا بھائی یا برادر محترم کہتے ہیں تو مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب قیامت قریب آئی جا رہی ہے، میں نے اپنے کو ان سے بہت چھوٹا سمجھ کر اس مذاکرہ کا کام شروع کرنے کو تو کر دیا لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہوا وہ ان ہی کی بہار آفریں اور مشک آگیں شخصیت کی بدولت ہوا، ورنہ میری جیسی حقیر شخصیت کے ذریعہ سے اُتنا بڑا اجتماع نہیں ہو سکتا تھا، اس مذاکرہ کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ آج سے دس روز پہلے ان کے عزیز بھانجے اور مولانا محمد رابع ندوی کے بڑے بھائی مولوی محمد ثانی حسنی کی وفات ہوگئی، یہ جانکاہ حادثہ نہ صرف ان دونوں کے لے، بلکہ دارالمصفین کے لیے بھی تھا، خیال آیا کہ اس اجتماع کو ملتوی کر دیا جائے، کیونکہ اس مذاکرہ کی روح اگر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی تھے تو اس کے دماغ مولانا محمد رابع ندوی تھے، یہ خاکسار اس روح اور دماغ کا محض ایک جسم تھا، مگر ان دونوں حضرات نے اپنے بے مثال ضبط، تحمل اور صبر کا ثبوت دیا، ان کے پیغامات آتے رہے کہ حادثہ سخت سہی لیکن سمینار ہو کر رہے گا اور ہوا، اس سے دارالمصنفین سے ان کی غیر معمولی محبت کا بھی اظہار ہوتا ہے، ہم اپنے مہمانوں سے معذرت خواہ ہیں کہ ان کو ہم فائیو اسٹار ہوٹل میں نہ ٹھہرا سکے، اعظم گڈھ ایک معمولی سا شہر ہے، جہاں اس ترقی یافتہ دور کی زندگی کی ساری آسائشیں میسر نہیں، یہ خیال ضرور ستاتا رہا کہ ہمارے غیر ملکی مہمان یہاں آجائیں گے، تو ہم ان کو کہاں ٹھہرائیں گے اور ان کی کیا ضیافت کر سکیں گے لیکن ہمارے دل میں ایک تمنا تھی، ایک آرزو تھی، اس بنا پر ہم نے سوچا کہ ہمارے مہمانوں کو تکلیف سہی لیکن یہ سمینار ہو کر رہے گا، میں یہ جانتا ہوں کہ ہمارے مہمانوں کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی لیکن میں اپنے بزرگوں کی روح، دارالمصنفین کے کارکنوں اور اپنی اشک بار آنکھوں کی طرف سے ان سے معافی مانگتا ہوں کہ اپنی تکلیفوں کو سمینار کے موضوع اور اسلامی علوم وفنون کی محبت کی خاطر نظر انداز کر دیں جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے، یہ تین روز ایسے محسوس ہوئے کہ

دارالمصنفین میں ایک دل کش اور سہانی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور علم وفن کے سیارے یہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں، یہ جارہے ہیں وہ آرہے ہیں، پیے ہوئے ہیں، پلارہے ہیں، قدم قدم پر، روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں، یہ تین دن ہماری زندگی کے بہت ہی قیمتی اور دل آویز لمحات کے ساتھ گذرے، ہماری زندگی کے بقیہ دن اسی کے یاد کے ساتھ گذریں گے کہ آپ حضرات اس دورافتادہ مقام کے سفر کی مشکلیں برداشت کر کے یہاں تشریف لائے، تکلیفیں اٹھائیں لیکن ہماری ہمت افزائی کی اور حوصلے بڑھائے، ہمیں یقین ہے کہ اس اجتماع کے بعد دارالمصنفین کے رفقا میں ایک نئی علمی روح کی تاب ناکی اور ایک نئی علمی زندگی کی درخشانی پیدا ہو جائے گی، کشمیر کے جناب عبدالرحمٰن کوندو صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، یہ انھوں نے بتایا کی سری نگر سے جموں تک پورا راستہ برف سے ڈھکا ہوا تھا، پھر بھی وہ دارالمصنفین کی محبت میں اس سمینار کی شرکت کے لیے یہاں پہونچ گئے اور ابھی ابھی لاہور سے بڑی صعوبتیں اور مصیبتیں برداشت کرے شیخ نذیر حسین مدیر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام تشریف لائے ہیں ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں، شبلی کالج کے سکریٹری جناب امتیاز احمد صاحب ایڈوکیٹ کے بھی شکر گذار ہیں، کہ انہوں نے تعاون کر کے اس سمینار کو کامیاب بنایا، ہم اس کالج کے اساتذہ اور اس کے دوسرے ملازمین کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے رات دن محنت کر کے ہر قسم کی سہولتیں پہونچائیں، ہم اپنے عزیز شاگرد ڈاکٹر محمد طاہر کے تو انتہائی ممنون ہیں، کہ انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر ہمارے مہمانوں کے کام و دہن کی لذت کا سامان کیا، اللہ تبارک وتعالےٰ ان کو اپنی زندگی میں ہر طرح خوش وخرم رکھے، ہم شبلی کالج کے طلبہ کے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے باورچی خانہ کے مشکل سے مشکل کام کو بڑی خوبی سے انجام دے کر ڈاکٹر طاہر کی مدد کی، اس کالج کے اساتذہ میں ڈاکٹر محمد صفی اور ڈاکٹر محمد جمال کے بھی ممنون ہیں، کہ انہوں نے ہمارے ایٹ ہوم کا انتظام بہت ہی خوش سلیقگی سے کیا، ہم دارالعلوم ندوۃ العلما کے اساتذہ اور طلبہ کے احسانات سے بھی گراں بار ہیں کہ انہوں نے مثالی نمونہ پیش کیا کہ ایک تقریب کو کامیاب بنانے میں مزدوروں کی طرح کام کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کیا، جب میں اپنی آنکھوں سے ان کو اپنے سروں پر کرسیاں اور میزیں لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے دیکھتا تو مجھ کو ندامت کے بہ جائے فخر ہوتا کہ دارالعلوم کے طلبہ ایسے جاں نثار بھی ہیں، جو

ضرورت کے وقت ہر قسم کا کام انجام دے سکتے ہیں، دار العلوم ندوۃ العلما کے اساتذہ میں مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی کی وہ جدوجہد ہمیشہ یادرہے گی جب کہ لکھنو، بنارس اور اعظم گڈھ کی مسافت کا خیال کے بغیر تینوں جگہوں کو ایک کر دیا تھا، وہ کبھی مہمانوں کی پیشوائی کرتے دکھائی دیتے، کبھی ضروری مشورے آکر دیتے، ان کا بس چلتا تو دارالمصنفین پر نچھاور ہو جاتے، ان پر دارالمصنفین کا حق تھا اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنا حق ادا کیا، مولانا محمود الازہار نے سمینار کو کامیاب بنانے میں جو محنت شاقہ کی اس کا شکریہ تو ادا ہو ہی نہیں سکتا اور شاید وہ اس شکریہ کو قبول کرنے کے لیے تیار بھی نہ ہوں کہ وہ اپنے اور ساتھی اساتذہ کے ساتھ دارالمصنفین اور ندوہ کو دو الگ چیز نہیں سمجھتے اور ہاں ندوہ کے کمسن استاد مولوی سلمان ندوی کا جو غضب کا اٹھان ہے، اس سے تو میری طرح اس اجتماع کے سارے حاضرین متحیر رہے، وہ بلبل شیوہ بیان کی طرح اس مذاکرہ میں چہچہاتے رہے، وہ جب عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں مقالوں اور تقریروں کا خلاصہ پیش کرتے تو اس سے متاثر ہو کر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بغل میں بیٹھا ہوا ان سے عرض کرتا کہ ایک دوسرا ابوالحسن علی ندوی تیار ہونے والا ہے، آپ کو اس کی فکر نہ ہونی چاہیے کہ آپ اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑ رہے ہیں، مولانا محمد رابع ندوی کا کیا شکریہ ادا کروں کہ وہ میرے عزیز ترین عزیز ہیں، ان کا شکریہ ادا کر کے خود اپنا شکریہ ادا کروں گا، اور کیا یہ ڈربن سے آئے ہوئے عزیزی ڈاکٹر سید سلمان ندوی کا بھی شکریہ ادا کروں، وہ یہیں پیدا ہوئے، ان کے والد بزرگ وار حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے استاذ علامہ شبلیؒ کی وصیت کے مطابق اسی آستانہ پر عمر گذاری، ان کو اپنے استاذ سے اس قدر محبت تھی کہ جب وہ حیات شبلی لکھ رہے تھے تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بعض اوقات ایک طرف ان کا قلم چل رہا تھا تو دوسری طرف ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اگر ڈاکٹر سلمان ندوی ڈربن سے یہاں آئے تو انھوں نے اپنا حق ادا کیا اور اپنے مولد کی خاک کو آنکھوں سے لگا کر سعادت حاصل کی۔

ہم یوپی کی حکومت کے وزیر جناب عمار رضوی صاحب کے بھی احسان مند ہیں، کہ انھوں نے اس سمینار میں شرکت کر کے دارالمصنفین کے مخطوطات کی نمائش کا افتتاح کیا، ان کی پوری کوشش تھی کہ یوپی کے وزیر اعلا اس موقع پر تشریف لائیں، مگر وہ اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے نہ آسکے، تو انھوں نے خود

اپنی تشریف آوری سے ہم کو نوازا، جس سے ان کے بے تکلف دوست شوکت سلطان صاحب سابق پرنسپل شبلی کالج کو بھی بڑی خوشی ہوئی، اس تقریب میں ہر قسم کی سہولت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس۔ایس۔پی نے پہونچائی جس کے لئے ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں، اور ہاں عزیزی احتشام الرحمٰن، شاکر الرحمٰن اور محمد طارق نے اس سمینار کی پوری کارروائی کو ریکارڈ کر کے جتنے کیسٹ تیار کیے ہیں، وہ بھی قابل ذکر ہے، یہ کیسٹ ہمارے کتب خانہ کے لیے قیمتی سرمایہ بن جائیں گے، عزیزی ڈاکٹر راشد مصطفیٰ نے اپنے ساتھی فوٹو گرافر محمد طارق کے ساتھ بڑے ذوق وشوق سے اس سمینار کا جو رنگین البم تیار کیا ہے، اس سے اس سمینار کی یاد برابر تازہ ہوتی رہے گی، ان عزیزوں نے اپنا یہ فرض ادا کر کے اپنی سعادت مندی اور دارالمصنفین سے محبت کا ثبوت دیا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی الوداعی تقریر، اور موثر دعاء : آخر میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مجمع کو اس طرح مخاطب فرمایا: حضرات! مجھے اب تقریر نہیں کرنی ہے، صرف آخری بات عرض کرنا چاہتا ہوں پھر دعا کروں گا، اور سب آمین کہیں گے، آپ حضرات کو معلوم ہے کہ میں مختلف مقامات پر جایا کرتا ہوں جہاں میری تقریر سے پہلے میرا تعارف بھی ہوا کرتا ہے، لیکن ایک تعارف کبھی نہ بھولے گا، جیسا وہ انوکھا تعارف تھا، ویسا ہی میرا انوکھا شکریہ بھی اس وقت ہوگا، مجھے ریاست حیدرآباد کے شہر سکندرآباد کی جامع مسجد میں سیرت پر تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، وہ میرے شباب کا زمانہ تھا، وہاں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کے صدر مولانا محمد علی نے میرا تعارف اس طرح کرایا کہ اس خدا کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں جس نے میرے ان مہمان خصوصی کو یہ یہ چیزیں عطا فرمائی ہیں اسی کا شکر ہے، اسی کی میں تعریف کرتا ہوں، آج میں بھی اسی کی تقلید کرتا ہوں، میں کسی کا شکریہ ادا نہیں کرتا، میں اس خدا کی حمد کرتا ہوں جس نے ان بھائیوں کو توفیق دی کہ وہ یہاں کھنچ کر آئے اور ہماری حوصلہ افزائی کی، سب تعریف اس خدا کی ہے، سب شکر اسی کا ہے کہ ہم کو آپ کو عمل کی توفیق دی، ہم اور آپ اپنے خدا سے اس بات کے طالب ہوں کہ اب اصل کام کرائے جس کا اعلان ہم نے اس وقت بڑی بلند آہنگی سے کیا ہے، ابھی ہم نے اصل کام میں سے تھوڑا سا کام انجام دیا ہے، جس کا نتیجہ ہمارے آپ کے سامنے ہے، اگر اس سے بہت زیادہ کام ہوا تو ہم آپ دیکھیں گے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، پھر میں خدا ہی کی

حصہ اول

مد لله الذی

ھ... لھذا وما کنا لنھتدی لو لا ا... ھدانا الا... یہی اس خدا کی تعریف ہے جس نے ہماری رہبری کی، ہم کو یہاں تک پہونچایا اور یہ ا... نت کہیں گے کہ ہم یہاں تک پہونچنے والے نہیں تھے، اگر توفیق الٰہی نہ ہوتی، آیئے خدا سے دعا ک... :

الحمد لله رب العٰلمین وصلی الله ... ک وتعالیٰ علیٰ خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد واله وصحبه اجمعین ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم، ربنا آتنا من لدنک رحمة وهئیی لنا من امرنا رشداً، ربنا لا تز... قلوبنا بعد اذهدیتنا وهب لنا من لدنک رحمة انک انت الوهاب، ربنا ولا تحملن... مالا طاقة لنا به، واعف عنا واغفرلنا، وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القو... الکافرین، ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان، ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رؤف رحیم.

اے اللہ! ہم اپنے علم پر نازاں نہیں ہیں، ہم علم پر کوئی بھروسہ نہیں کرتے کہ ہم نے دیکھا کہ ان مستشرقین نے جن کا علم ہم میں سے بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ تھا، کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں اور دریا میں گئے اور دامن بھی ان کا تر نہیں ہوا، دریائے سیرت میں غوطہ لگایا اور ایک بھی موتی لے کر نہ ابھرے، قرآن مجید کے بحر علوم اور بحر معارف میں غواصی کی اور کچھ بھی ان کے حصہ میں نہیں آیا، اے اللہ! ہم ایسے علم سے پناہ مانگتے ہیں، جو علم حقیقت تک نہ پہونچائے، جو معرفت عطا نہ کر سکے، جو صداقت کی روشنی نہ دکھا سکے، جو عمل میں رہبری نہ کر سکے، اے اللہ! ہم تجھ سے علم نافع کے طالب ہیں، اے اللہ! ہمیں علم اور عمل کی گم راہیوں سے بچا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆